مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی، فرسٹ فلور شیرستان بلڈنگ
دین محمد وفائی روڈ، بالمقابل ایس ایم آرٹس کالج،
کراچی۔ ۷۴۲۰۰ (پاکستان)۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۳ ماہ صفر المظفر ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۴ء عدد ۴

فہرست مضامین

☆☆☆

شذرات

رام پور سے دار المصنفین کے بزرگوں کا تعلق بہت پرانا ہے، علامہ شبلی مولانا ارشاد حسین مجددی کے درس سے فیض یاب ہوئے اور ۱۸۸۸ء میں نواب مشتاق علی خاں کے زمانے میں ریاست کے مدار المہام جنرل عظیم الدین خاں مرحوم نے ان کو مدرسہ عالیہ کی تنظیم نو کے لیے مدعو کیا اور کتب خانہ کی ترتیب کے لیے ایک رپورٹ لکھنے کی فرمایش کی، کتب خانہ ان کی دل چسپی کی خاص چیز تھا، اس سے استفادے کے لیے وہ اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کئی بار وہاں تشریف لے گئے، راقم کو بھی مدت سے کتب خانہ دیکھنے کا اشتیاق تھا، جناب وقار الحسن صدیقی افسر بکار خاص اور ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی اسسٹنٹ لائبریرین نے کئی بار دعوت دی اور سمیناروں میں بھی مدعو کیا مگر یہ تمنا اس سال برآئی جب وہاں ۱۴ رتا ۱۶ ر مارچ کو "اردو ہندی زبان و ادب کے فروغ میں رام پور کا حصہ" کے عنوان سے ایک قومی سمینار ہوا، کتب خانے کی پرشکوہ عمارت اور اس کی ترتیب و آرایش کا شان دار نظام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی مگر مدرسہ عالیہ کے ختم ہوجانے کی سخت صدمہ ہوا۔

افتتاحی جلسہ پروفیسر نصیر احمد خاں کی صدارت میں رنگ محل قلعہ رام پور کی حامد منزل میں ہوا، سمینار سے دو ایک روز قبل رام پور کے معمر وکیل اور اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر و ادیب جناب شبیر علی خاں شکیب کا انتقال ہوگیا تھا، پہلے ان پر تاثراتی تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے اور تعزیتی تجویزیں منظور کی گئیں، پھر ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی اور جناب مسعود ظفر کی کتابوں نقد و اثر - عربی زبان و ادب کی خدمت میں رام پور کا حصہ اور رام پور کے شکار اور شکاری کے اجرا کی تقریب عمل میں آئی، اس کے بعد وقار الحسن صاحب نے خیر مقدمی تقریر میں سمینار کے موضوع کی اہمیت بیان کی، ڈاکٹر نثار فاروقی (دہلی) نے رام پور کی ادبی خدمات پر تقریر کی اور ڈاکٹر ناگیندر لال نے رام پور میں ہندی شاعری کا ارتقا اور پروفیسر اقتدار حسین (علی گڑھ) نے "رام پور کی ثقافت میں اردو کا حصہ" کے عنوان سے مضامین پڑھے، صدارتی تقریر معلومات افزا تھی، اس میں یہ تجویزیں پیش کی گئیں کہ ۱- اردو کلچر سینٹر رام پور میں قایم ہو، ۲- اردو کورس ۱۶۰ گھنٹے میں سکھانے کا انتظام ہو، ۳- اردو کے تلفظ کے لیے صوتی لغت تیار کیا جائے، ۴- ہندوستان میں اردو کا سروے ہو، ۵- یونیورسٹیوں کے مقالات پر لائبریری نظر

رکھے، ڈاکٹر عبدالسلام (لکھنؤ یونیورسٹی) کے شکریے پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

سمینار کا موضوع علاقائی تھا اس لیے اکثر مقالہ نگار رام پور اور اس کے مضافات کے تھے جن میں بہت سے نوجوانوں کے مقالوں میں مشق و پختگی کی کمی تھی تاہم اچھے اور پختہ مشق اہل قلم بھی کم نہ تھے، بریلی سے معارف کے قدیم مضمون نگار ڈاکٹر لطیف حسین ادیب اور ان کے خویش شمس بدایونی نے بہت اچھے مقالے پڑھے لیکن بریلی ہی کے محمود حسین صاحب کے مقالے میں مولانا ارشاد حسین صاحب کی اردو خدمات سے تعرض ہی نہیں کیا گیا تھا، بیرونی مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) ڈاکٹر مولا بخش (دہلی یونیورسٹی) پروفیسر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) پروفیسر مظفر حنفی (دہلی) اور راقم شریک ہوئے تھے، سمینار میں مختلف اصناف ادب، شاعری، تنقید، تحقیق، افسانہ و ناول نگاری، طنز و مزاح، تذکرہ و سوانح نگاری، وفیات نگاری، بچوں کے ادب میں رام پور اور نوابوں کا حصہ اور بعض ممتاز شعرا و ادبا پر سیر حاصل مضامین پڑھے گئے مگر مذہبی علوم تفسیر، حدیث، فقہ و کلام وغیرہ میں رام پور کے اہل علم کی خدمات پر مقالے کی کمی محسوس ہوئی، اردو ادب کے فروغ میں رام پور کے ہندووں کا حصہ بھی زیر بحث نہیں آیا، "ہندی کے فروغ میں رام پور کا حصہ" کے لیے الگ سیشن ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا، تاہم یہ سمینار نظم و انتظام کی خوبی کا نمونہ اور کامیاب تھا۔

دوسرا قومی سمینار شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹ ر ۲۰ ر مارچ کو "اسلامی فکر میں شیخ احمد سرہندی کا حصہ" کے عنوان سے ہوا جس کا افتتاح وائس چانسلر جناب نسیم احمد صاحب نے کیا اور پروفیسر عبدالحق امیر جماعت اسلامی ہند نے کلیدی خطبہ دیا، اس کی صدارت کا قرعہ فال اس ناچیز کے نام نکلا، پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی مہمان خصوصی کی حیثیت سے رونق افروز ہوئے، صدر شعبہ پروفیسر عبدالعلی نے سمینار کی غرض و غایت اور شیخ احمد کی اہمیت و عظمت پر مبسوط تقریر کی، سمینار کے کنوینر ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی نے نظامت کی اور آخر میں شرکا کا شکریہ ادا کیا، اسی روز مقالات کے تین جلسے بالترتیب پروفیسر محمد سالم قدوائی (علی گڑھ) پروفیسر عضد الدین خاں (علی گڑھ) پروفیسر عبدالقادر جعفری (الہ آباد یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوئے اور قریباً ۱۵ مقالات پڑھے گئے، پروفیسر احتشام احمد ندوی (علی گڑھ) اور پروفیسر یسین مظہر صدیقی (علی گڑھ) کے مقالے "وحدت الوجود و وحدت الشہود" اور "فکر مجدد میں خلفاے راشدین

کا مقام" خاص طور پر موضوع بحث رہے، دوسرے روز مقالات کے پانچ جلسے ہوئے، چوتھے جلسے کی صدارت پروفیسر محمد رفیق (علی گڑھ) نے کی، اسی میں راقم اور پروفیسر اقتدار حسین (علی گڑھ) نے مقالے پڑھے، باقی جلسوں کی صدارت بالترتیب پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی (علی گڑھ) پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (علی گڑھ)، پروفیسر کفیل احمد صدیقی (علی گڑھ) اور پروفیسر محمود الحق (علی گڑھ) نے کی، آخری جلسہ پروفیسر احتشام احمد ندوی کی صدارت میں ہوا جس میں خاص شرکا نے اپنے تاثرات ظاہر کیے، ڈاکٹر ظفر الاسلام کی اختتامی تقریر بڑی پر اثر تھی، سمینار میں وقت کی پوری پابندی کی گئی، مقالوں پر بحث و مباحثہ بھی ہوا، سمینار کی کامیابی کے لیے پروفیسر عبدالعلی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام ستایش کے مستحق ہیں۔

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری بڑے فعال شخص ہیں، انہوں نے اپنے وطن مظفر پور ضلع اعظم گڑھ میں ۱۵ برس پہلے جامعہ اسلامیہ کے نام سے جس مدرسہ کی داغ بیل ڈالی تھی اب وہ ایک عظیم الشان ادارہ میں تبدیل ہوگیا ہے، اس کے احاطے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے ایک ریسرچ سینٹر قایم کیا ہے، جس کی پرشکوہ اور دل کش عمارت میں ایک وسیع کتب خانہ اس لیے قایم کیا گیا ہے کہ حدیث نبویؐ کی خدمت و تحقیق کا کام انجام پائے، اس مرکز کا افتتاح ۲۴ر مارچ کو مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم ندوۃ العلما نے کیا، اس موقع پر جامعہ کے بانی نے اپنے استاذ و مرشد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی یاد میں ایک دو روزہ سمینار بھی کرایا جس کا افتتاحی جلسہ مولانا محمد رابع ندوی کی صدارت میں ۲۴ر مارچ کو ہوا اور اسی روز مغرب بعد مقالات کا پہلا اور ۲۵ر مارچ کو دوسرا اور تیسرا جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا جس میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، (وقف) مظاہر العلوم سہارن پور، جامعہ رحمانیہ مونگیر، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ اسلامیہ دہلی کے فضلا نے حضرت شیخ کے علمی و عملی کمالات پر تقریریں اور مقالے پیش کیے، گو مقالات کے جلسے وقت سے نہیں شروع ہوتے تھے اور بعض مقالہ نگاروں سے متعینہ وقت کی پابندی کرائی جاتی تھی اور بعض سے نہیں، پھر مقالات پر بحث و مباحثہ کا وقت بھی نہیں دیا جاتا تھا، تاہم سمینار اور اس کے سارے پروگرام کی کامیابی پر بانی جامعہ اور ان کے لایق فرزند ڈاکٹر ولی الدین مبارک باد کے مستحق ہیں، ۲۵ر مارچ کی شب کا دینی جلسہ بھی بہت کامیاب تھا۔

☆☆☆

مقالات

کتب تفاسیر کی اسرائیلی روایات کا تنقیدی جایزہ

از:- ڈاکٹر ہمایوں عباس☆

بائبل میں لفظ اسرائیل مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے:-

(الف) اضحاق کے بیٹے یعقوب کے لیے، (ب) اس کی اولاد یعنی عبرانیوں کے بارہ قبیلوں کے لیے، (ج) شمال کے دس قبیلوں کے لیے جن میں افرائیم پیش پیش تھا۔ (قاموس الکتاب، ص ۴۸)

اسرائیلیات کا لفظ اسرائیل سے بنا ہے، اس کا اطلاق یہودی منقولات پر ہوتا ہے یا اس سے مراد یہودی ثقافت کی وہ گہری چھاپ ہے جو قرآن کی بعض آیات کی تفسیر پر لگی ہوئی ہے لیکن اسرائیلیات میں ہم وسیع مفہوم پیدا کر کے اس میں نصرانی ثقافت کو بھی شامل کر رہے ہیں، لہٰذا جب یہ کہا جائے گا کہ اسرائیلیات سے یہودی و نصرانی دونوں ثقافتوں کی چھاپ مراد ہے تو اسرائیل محض تغلیباً کہا جائے گا، یہودی ثقافت کا تمام تر دارو مدار تورات پر تھا، یہودی تورات کا اطلاق اپنی تمام مقدس کتابوں پر کرتے ہیں جن میں زبور بھی شامل ہے، تورات کو جو کہ اسفار موسیٰ علیہ السلام ہیں عہد نامہ قدیم کہا جاتا ہے، تورات کے علاوہ یہودیوں کے ہاں کچھ سنن، نصائح اور شروح بھی تھے جن کو اگرچہ خود موسیٰ علیہ السلام نے تو نہیں لکھوایا تھا البتہ ان کے پیروکاران سے بہ طریق مشافہہ نقل کرنے کے دعوے دار تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اسفار، نصائح اور شروح میں اضافہ ہوتا گیا، بعد میں جب ان کو مدون کیا گیا تو ان کا نام تلمود رکھا گیا، نصرانیوں کی ثقافت کا دارو مدار انجیل پر تھا، عیسائیوں کی جو معتبر انجیلیں تھیں اور جن کے ساتھ رسولوں کے کچھ صحایف، خطوط اور مکاشفات شامل تھے ان کو عہد نامہ جدید کہا جاتا ہے، اگر ہم تورات و انجیل کا مطالعہ کریں تو حقیقت آشکارا

☆ شعبۂ اسلامیات، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

ہوتی ہے کہ دونوں کتابیں ایسے عقاید و اعمال اور احکام پر مشتمل ہیں جن میں قرآن بھی ان کا ساتھ دیتا ہے، خاص کر انبیا کی تاریخ میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے اور قرآن ان کی تصدیق بھی کرتا ہے لیکن اس مشابہت میں ایک بین فرق ہے کہ تورات و انجیل میں بے انتہا اور بے مقصد تفصیل ہے، واقعات میں ہر قسم کا غث و سمین موجود ہے مگر قرآن کسی واقعہ کا وہی حصہ بیان کرتا ہے جو انسانیت کے لیے باعث عبرت و موعظت ہوتا ہے، احکام میں وہ ایک کلیہ یا بنیادی مسئلہ فراہم کر دیتا ہے، جزئیات و تفاصیل میں نہیں پڑتا یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی واقعے کا لب لباب پیش کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ (غزل کاشمیری کے مضمون سے اقتباس)

اسرائیلیات کی اقسام (الف) صحت و عدم صحت کے اعتبار سے اسرائیلیات کے اقسام حسب ذیل ہیں:

i- صحیح (مثال: سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ کے تحت تفسیر ابن کثیر میں ہے)۔ ii- (مثال: سورۃ ق کے شروع میں ایک روایت نقل کر کے لکھتے ہیں: فاسناد هذا الاثر فيه انقطاع)۔ iii- موضوع۔

(ب) ہماری شریعت کی مخالفت و موافقت کے اعتبار سے اقسام:

کسی اسرائیلی روایت کی ہماری شریعت کے موافق یا مخالف ہونے کے اعتبار سے تین اقسام ہیں:

i- ہماری شریعت کے موافق ii- ہماری شریعت کے مخالف iii- شریعت محمدی کا سکوت۔

(ج) اسرائیلی روایات کی موضوعاتی تقسیم:

موضوع کے اعتبار سے اسرائیلی روایات کی درج ذیل تین اقسام ہیں:

i- عقاید سے متعلقہ اسرائیلی روایات ii- احکام سے متعلقہ اسرائیلی روایات iii- حوادث زمانہ یا وعظ و نصیحت سے متعلقہ اسرائیلی روایات۔

تفسیر اور اسرائیلی روایات تفسیر میں اسرائیلیات کی ابتدا عہد صحابہ سے ہوئی، اکثر دفعہ ایسا ہوتا کہ کوئی صحابی قرآنی قصہ پڑھتے تو اس کی مزید توضیح و تشریح کے لیے اہل کتاب سے پوچھ لیتے لیکن صحابہ ہر چیز کا سوال اہل کتاب سے نہ کرتے، ان کا سوال اکثر و بیشتر اس واقعہ کی تفصیل سے

متعلق ہوتا جسے قرآن نے مختصراً بیان کیا، عقاید و احکام کے بارہ میں بھی صحابہ اہل کتاب سے استفسار نہ کرتے، ایسے سوالات سے بھی احتراز کرتے جو قصے یا کہانیوں کی لایعنی تفاصیل کے متعلق ہوتے مثلاً اصحاب کہف کتنے تھے؟ ان کے کرتے کا رنگ کیسا تھا؟ کشتی نوح کا طول و عرض کیا تھا؟ خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا اس کا نام کیا تھا؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ "صحابہ اس قسم کے فضول تکلفات کو قبیح اور وقت کا ضیاع خیال کرتے تھے"۔ (الفوز الکبیر)

صحابہ کا طرز عمل آپ ﷺ کے اس ارشاد کے عین مطابق تھا "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی میں کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر ایمان لائے"۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسير باب قوله تعالیٰ اٰمنا بالله و ما انزل الينا)

صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جب وہ اہل کتاب سے کوئی سوال کرتے اور وہ غلط جواب دیتے تو اس کو رد کر دیتے اور ان کی غلطی کو ان پر واضح کرتے، صحیح بخاری کی کتاب الجمعة کی روایت کے مطابق یوم جمعہ میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اس میں جو مانگا جائے وہ مل جاتا ہے، اس گھڑی کے تعین اور اس بات میں کہ آیا یہ باقی ہے یا اٹھ گئی ہے، اگر باقی ہے تو آیا ہر جمعہ میں ہوتی ہے یا سال بھر میں صرف ایک جمعہ میں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس گھڑی کے بارہ میں کعب الاحبار سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ یہ گھڑی دوران سال صرف ایک بار ہوتی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہر جمعہ کو ہوتی ہے، چنانچہ کعب الاحبار نے دوبارہ تورات کا مطالعہ کیا تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بات کو سچ پایا۔ (ارشاد الساری للقسطلانی، ج ۲، ص ۱۹۰)

اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ ہر بات بلا چون و چرا قبول نہ کرتے تھے اگر کوئی بات صحیح نہ سمجھتے تو رد کر دیتے اور روایت اخذ کرنے میں اس دایرہ سے نہ نکلتے جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا:

"بلغوا عني ولو آية و حدثوا عن بني اسرائيل ولا حرج ومن كذب على متعمدا فليتبوأ مقعدهٗ من النار"۔ (الصحيح البخاری، كتاب الانبياء،

باب ماذکر عن بنی اسرائیل)

"یعنی میری طرف سے لوگوں تک احکام پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اور بنی اسرائیل سے روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے"۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ "یہ امر محتاج بیان نہیں کہ نبی کریم ﷺ جھوٹی روایات بیان کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کے جھوٹا ہونے کا تمہیں علم نہ ہو بنی اسرائیل کے بارے میں وہ بیان کیجیے کیوں کہ سچی بات کی نقل و روایت میں کچھ مضایقہ نہیں"، دوسری حدیث بھی اس کے مانند ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا "اہل کتاب کی تصدیق کیجیے نہ تکذیب" جو بات سچی اور قطعی ہو اس کی روایت کرنے سے آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا۔ (فتح الباری، ج۶، ص۳۲۰)

اسرائیلیات کے معروف روات اسرائیلی روایات عموماً درج ذیل صحابہ، تابعین یا تبع تابعین سے مروی ہیں:

(الف) صحابہ

۱-حضرت ابوہریرہ ۲-عبداللہ بن عباس ۳-عبداللہ بن عمرو بن العاص

۴-عبداللہ بن سلام ۵-تمیم داری

(ب) تابعین

۱-کعب الاحبار ۲-وہب بن منبہ

(ج) تبع تابعین

۱-محمد بن السائب الکلبی ۲-عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ۳-مقاتل بن سلیمان

۴-محمد بن مروان السدی (اسرائیلیات فی التفسیر والحدیث ڈاکٹر محمد حسین الذہبی ص۹۳)

کتب تفاسیر اور اسرائیلی روایات ہر مفسر نے اپنا ایک جداگانہ تفسیری منہج اختیار کیا، اسرائیلی روایات کے نقل کرنے میں بھی مفسرین نے مختلف اسلوب اختیار کیے، اس اعتبار سے کتب تفسیر کو مختلف انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

۱-مفسر ہر روایت کو سند کے ساتھ نقل کر دیتے ہیں اور کوئی نقد نہیں کرتے، اس ضمن میں

معروف ترین تفسیر محمد بن جریر بن یزید طبری (م ۳۱۰ھ) کی جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے، امام طبری نے اسناد کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا لیکن ان کی جانچ پڑتال قاری پر چھوڑ دی، وہ اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ کعب الاحبار، وہب بن منبہ، ابن جریج اور سدی سے بہ کثرت اسرائیلی واقعات نقل کرتے ہیں اور محمد بن اسحاق کے نومسلم نصاریٰ سے سنے ہوئے واقعات بھی روایت کرتے ہیں، بعض اوقات امام طبری ایک ناقد کی حیثیت سے روایات کا جائزہ بھی لیتے ہیں، جیسے سورۃ الکہف کی آیت ۹۴ (قالوا یا ذا القرنین ان یاجوج و ماجوج ..... ان تجعل بیننا و بینهم سدا) کے تحت ایک روایت کی سند اسی طرح درج کی:

حدثنا به احمد بن یوسف قال: حدثنا القاسم، قال: حدثنا حجاج، عن هارون، عن ایوب، عن عکرمة قال: کہ عکرمہ کہتے ہیں: "انسان کی تعمیر کردہ دیوار کو سُد بفتح السین اور جو اللہ کی بنائی ہو اس کو سُد بضم السین کہا جاتا ہے"۔

اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واما ما ذُکر عن عکرمة فی ذلک فان الذی نقل ذلک عن ایوب عن هارون و فی نقله نظر، ولا یعرف ذلک عن ایوب من روایة ثقات اصحابه۔ (جامع البیان، ج۱۶، ص۱۳)

ہارون نے ایوب سے روایت کی اور ایوب نے عکرمہ سے اور ہارون کی ایوب سے روایت محل نظر ہے، ایوب کے قابل اعتماد تلامذہ سے کسی نے بھی یہ روایت نہیں کی۔

۲-بعض مفسرین نے اسرائیلی روایات مع سند نقل کی ہیں اور ان پر جرح بھی کی، تفسیر القرآن العظیم (حافظ عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن عمرو بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ) البحر و الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز (ابومحمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی متوفی ۵۴۶ھ) اس کی مثالیں ہیں، ابوحیان اندلسی (متوفی ۶۵۴ھ) کی البحر المحیط کو بھی اسی زمرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

۳-کچھ مفسرین نے بلاسند اسرائیلی روایات کو نقل کیا اور ان پر کوئی تنقید بھی نہیں کی جیسے مقاتل بن سلیمان (م ۱۵۰ھ) کی تفسیر اور الکشف والبیان عن تفسیر القرآن از ثعلبی (م ۴۲۷ھ)۔

۴۔ تفسیر کی بعض کتب میں اسناد کا التزام تو نہیں کیا لیکن اسرائیلی روایات کو نقل صرف اس لیے کیا کہ ان کا رد کیا جا سکے، جیسے سید محمود آفندی آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ) کی تفسیر روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی)۔

۵۔ تفسیر المنار از سید محمد رشید رضا (م ۱۳۵۴ھ) کا شمار ایسی تفاسیر میں ہوتا ہے جنہوں نے شدت سے اسرائیلیات کا رد کیا اور اس کے لیے قرونِ اولیٰ کے اصحاب پر تنقید سے بھی گریز نہیں کیا۔

حضرت سیدنا آدم علیہ السلام

حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم مبارک قرآن کریم میں ۲۵ مقامات پر آیا ہے۔[1]

مجد الدین فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ آپ کے پانچ نام ہیں: الانسان، البشر، بو البشر، آدم، الخلیفة[2] چوں کہ آپ ہی سے سلسلہ انسانیت کا آغاز ہوا اس لیے قرآن کریم نے قصۂ آدم کو مختلف سورتوں میں ہدایت انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے ذکر کیا۔

قرآن کریم کی درج ذیل سورتوں میں قصۂ آدم علیہ السلام کا کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً ذکر موجود ہے۔

سورة البقرة، سورة الاعراف رکوع-۲، الحجر رکوع-۳، بنی اسرائیل رکوع-۷، الکهف رکوع-۷، طه رکوع-۷، ص رکوع-۵۔

ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کے متعلق اسرائیلی روایات کی کثیر تعداد ہماری کتب تفاسیر میں نقل ہوئی ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(الف)

آدم علیہ السلام کے بارہ میں عیسائی دنیا میں معروف ہے کہ آپ گناہ لے کر زمین پر آئے اور یہاں آکر طویل مدت روتے رہے تب آپ کی توبہ کی قبولیت کا مژدہ سنایا گیا، انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کے تصور کا نتیجہ ''عقیدہ کفارہ'' نکلا۔

الف ایس خیر اللہ نے لکھا ہے ''مسیح پر ایمان لانے والوں کے لیے اس کا مطلب ہے کہ مسیح کی صلیب ہماری کفارہ گاہ ہے، یہاں پر کامل قربانی دی گئی، یہاں خون بہایا گیا جو تمام

بنی نوع انسان کے لیے مؤثر ہے''۔[3]

آدم علیہ السلام کی گریہ وزاری کے متعلق چند روایات درج ذیل ہیں:

۱۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدم وحوا علیہما السلام دو سو برس روئے اور چالیس روز تک کچھ نہ کھایا پیا، حضرت آدم سو برس تک حوا کے پاس نہ آئے۔

۲۔ یونس بن حباب اور علقمہ بن مرثد فرماتے ہیں کہ اگر سارے زمین والوں کے آنسو جمع کیے جائیں تو آدم علیہ السلام کے آنسو بڑھ جائیں گے۔[4]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی توبہ جنت ہی میں قبول کر لی گئی تھی نہ کہ آپ زمین پر آکر روتے رہے، انه هو التواب الرحیم[5] کا تقاضا یہی ہے۔

جنت ہی میں توبہ کی قبولیت کے حوالہ سے پیر محمد کرم شاہ لکھتے ہیں:

''نیچے اترنے کا حکم دو بار ہوا پہلے لغزش کے صادر ہونے کے بعد، پہلے حکم سے اظہار ناراضگی مقصود تھا اور دوسری بار منصب خلافت سنبھالنے کے لیے، دونوں حکموں کی غرض وغایت الگ الگ ہے اس لیے یہاں تکرار نہیں''۔[6]

علامہ صابونی لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو دوبار ہبوط کا حکم تاکید کے لیے دیا گیا ہے اور اس امر کو بیان کرنے کے لیے کہ آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا قیام زمین میں ہے، جنت میں نہیں۔[7]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فأهبطه بعد التوبة ليعمر ارضه بنسله۔[8]

''پس اللہ نے آپ کو توبہ (قبول کرنے) کے بعد زمین پر اتارا تاکہ اس (اللہ) کی زمین کو اپنی نسل کے ذریعے آباد کریں''۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بہ طور عتاب اور سزا تھا مگر جب بعد میں خطا معاف کر دی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیق آدم کے وقت فرشتوں سے کیا جا چکا تھا

کہ زمین کے لیے ان کو خلیفہ بنانا ہے''۔[9]

ان عبارات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے تو آپ کی توبہ قبول ہو چکی تھی لیکن ''یہاں نہ حقیقت میں گناہ تھا اور نہ گناہ سے توبہ اور اس کی قبولیت بلکہ وہ آدم علیہ السلام کی جلالت کے لحاظ سے ایک بلند مرتبہ سے پیچھے رہنا تھا اور اس کے شدتِ احساس کے ساتھ آیندہ اس سے باز رہنے کا عزم توبہ تھا اور خالق کی طرف سے ان کو اپنی پوری مہربانی وعنایت کے استحقاق کی اطمینان دہانی قبول توبہ ہے''۔[10]

جب زمین پر تشریف لانے سے قبل توبہ قبول ہو چکی تو زمین پر آکر گناہ کو یاد کر کے صدیوں رونے کی روایات کو نقل کرنا عیسائیوں کے پیدائشی گناہ گار کے تصور کو سہارا دینے کے لیے نہیں تو اور کیا ہے؟

علامہ احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں ''فتاب علیه: آدم علیہ السلام نے ان کلمات کے ذریعے توبہ کی، اللہ تعالیٰ اسی وقت ان پر رجوع برحمت ہوا اور ان کی توبہ قبول فرمالی، بعض علما کے نزدیک آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے کلمات لینا اور ان کے ذریعے توبہ کرنا اور ان کی توبہ قبول ہونا جنت سے اترنے کے بعد ہوا اور توبہ بھی کئی سو سال بعد قبول ہوئی، دو سو بلکہ تین سو سال آہ و بکا، گریہ وزاری اور ندامت کے حال میں ان پر گزرے''۔

شاہ عبد العزیزؒ نے تفسیر عزیزی میں ص ۱۸۴، جلد اول میں یہی فرمایا ہے لیکن حق یہ ہے کہ جنت سے باہر آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو وہ کلمات عطا فرما دیے تھے اور اسی وقت انہوں نے توبہ کی جو قبول ہوگئی اور اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا معاف فرمادی، البتہ یہ ممکن ہے کہ معافی کے باوجود آدم علیہ السلام اپنی لغزش کو یاد کر کے ندامت کے طور پر سالہا سال تک گریہ وزاری میں مشغول رہے ہوں جو خوف وخشیتِ الٰہیہ کا تقاضا اور کمال عبدیت کی دلیل ہے''۔[11]

نصاریٰ کا رد کرتے ہوئے سورۃ الاعراف میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہاں اس مغالطہ سے متنبہ رہنا ضروری ہے جو نصاریٰ کو پیش آیا، وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی اس دنیا میں شیطان کی طرح لعنتی ہو کر اترا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کفارہ کا ایک خانہ ساز عقیدہ گھڑا ہے، قرآن نے بقرہ میں

بھی اور یہاں بھی نہایت واضح رہنمائی دی ہے کہ آدم توبہ کے بعد اپنی پچھلی خطا کے خمیازے سے بالکل پاک ہو کر اس دنیا میں آئے اور اس دنیا میں ان کا بھیجا جانا اس لیے ہوا کہ وہ اور ان کی ذریت شیطان کے مقابل میں اپنے عزم وایمان سے اپنے آپ کو اس عزت کا حق دار ثابت کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی اور جو شیطان کے حسد کا باعث ہوئی''۔[12]

(ب)

قصہ آدم کے ضمن میں یہ بات بھی معروف ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا؟ کہا یہ جاتا ہے کہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر شیطان اندر گیا، اس حرکت سے قبل شیطان خوبصورت چوپایہ تھا۔[13]

اس روایت کا ماخذ عہد نامہ عتیق کی کتاب تکوین کے یہ الفاظ ہیں:

''پہلے گناہ کا بیان''

''اور سانپ زمین کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند بنا چکا تھا، مکار تھا، اس نے عورت سے کہا کیا در حقیقت خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا...... الخ''۔ (باب-۳)

''اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا، چوں کہ تو نے یہ کیا ملعون ہے تو تمام چرندوں اور درندوں میں تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی زندگی کے تمام ایام تو خاک چکھے گا''۔ (باب-۳)

کتاب تکوین کی ان آیات کی بنیاد پر ہماری کتب تفاسیر میں نقل ہونے والی روایات اس درجہ صحت کو نہ پہنچ سکیں کہ انہیں قبول کیا جائے۔

محتاط مفسرین نے ان روایات کو قبول نہیں کیا، امام رازی لکھتے ہیں:

اعلم ان هذا وامثاله یجب ان لا یلتفت الیه

یعنی یہ اور اس جیسی روایات کی طرف توجہ ہی نہ کرنی چاہیے۔[14]

ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:

وقد اکثر المفسرون فی نقل قصص کثیرة فی قصة آدم و حوا

والحية والله اعلم بذلک

مفسرین نے آدم، حوا اور سانپ کے بارے میں بہ کثرت قصے نقل کیے ہیں اور حقیقت حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وقد ذکر المفسرون ھھنا اخبارا اسرائیلیة

مفسرین نے یہاں بہت سے اسرائیلی قصے نقل کر دیے ہیں۔[15]

علامہ مراغی لکھتے ہیں:

آدم علیہ السلام اور حوا کا جنت سے زمین پر آنے کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اکثر اسرائیلیات میں سے ہے، اہل علم کے نزدیک یہ صحیح نہیں۔[16]

علامہ بلاغی لکھتے ہیں:

قد رویت فی کیفیة وصوله الیها والوسوسة والمخاطبة بالاغواء روایات لم تصح (آلاء الرحمن)

شیطان آدم و حوا تک کیوں کر پہنچا اور وسوسہ انگیزی کس طرح کی ورغلانے کے لیے کیا گفتگو کی، اس سب کے بارے میں ایسی روایات آئی ہیں جو پایہ صحت تک نہیں پہنچیں۔[17]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

"ہمارے مفسرین نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے، جس میں شیطان سانپ، طاؤس سب کا ذکر آیا ہے، یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے اس سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقاید میں بہر حال داخل نہیں اور اس کا ماخذ قرآن وسنت نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں، اس لیے جو اہل تفسیر زیادہ محتاط، محقق ہوئے وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کر گئے ہیں"۔[18]

علامہ احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں:

"جن اقوال میں مور اور سانپ کے ذریعہ شیطان کے جنت میں داخل ہونے کا ذکر وارد ہے یا از خود اس کا جنت کے دروازے تک پہنچ جانا مذکور ہے، وہ سب از قبیل اسرائیلیات اور ناقابل التفات ہیں"۔[19]

محققین کے نزدیک جب یہ طے ہوا کہ توبہ جنت ہی میں قبول ہوگئی، شیطان اور سانپ والا قصہ بھی باطل ہے تو پھر شیطان نے کس طرح وسوسہ ڈالا، اس بارہ میں امام بیضاوی کی تحقیق کے مطابق شیطان کا اعزاز کے طور پر وہاں رہنا اور داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ایسی ممانعت نہ ہوئی تھی کہ داخل نہ ہو سکے، چوں کہ آدم و حوا کا امتحان مقصود تھا اس لیے وسوسہ کے لیے داخلہ کا موقع دیا گیا، علامہ قاسمی کے نزدیک وسوسہ ڈالنے کا عمل مشافہتاً ہوا، ابن مسعود، ابن عباس اور جمہور علما کی یہی رائے ہے اور اس کی دلیل قرآن کریم کی آیات کا اسلوب ہے۔

قرآن میں ہے:

ھل ادلک علی شجرة الخلد وملک لا یبلی[20]

کیا میں تمہیں آگاہ کروں ہیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو۔

ما نھا کما ربکما عن ھذہ الشجرة الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین[21]

(اور کہا) تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے (زندہ رہنے) والے۔

وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین[22]

اور ان سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ قسمیں اٹھانے کا یہ عمل آمنے سامنے ہوا۔[23]

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس سلسلہ میں کہ شیطان نے کس طرح وسوسہ ڈالا، لکھتے ہیں

"علمائے اسلام سے اس کے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں:

۱- اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا لیکن پھر بھی اس کا ایک گناہ گار اور نابکار مخلوق کی حیثیت سے جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے، اس لیے اس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم و حوا سے یہ گفتگو کی اور ان کو لغزش میں ڈال دیا، آیت اھبطوا منھا جمیعا اسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اس کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

۲- جس طرح ایک آواز ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دور جاسکتی ہے یا جس طرح وائرلیس میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل دور پہنچایا جاسکتا ہے اس طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ قربت یا بالمشافہ مخاطبت کے بغیر شیطان کا وسوسہ نفس انسانی تک پہنچ جائے اور اس پر اثر انداز ہو تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنت سے باہر رہ کر حضرت آدم وحوا کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا اور ان کو بہکانے کی کوشش کی، آیت **فوسوس لهما الشیطان** سے یہی ظاہر ہے"۔[۲۴]

(ج)

کتب تفاسیر میں اسرائیلی روایات کے حوالہ سے حضرت آدم وحوا کے بارہ میں ایک روایت، آیت هو الذی خلقکم من نفس واحدة و جعل منها زوجها......[۲۵] کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر اس سے اس کی بیوی بنائی تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے، کے تحت درج کی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"حضرت سمرہ بن جندب ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا، جب حوا حاملہ ہوگئیں تو ان کے پاس ابلیس گیا، حوا کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا، ابلیس نے ان سے کہا تم اس کا نام عبدالحارث رکھ دو، انہوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا پھر وہ بچہ زندہ رہا، یہ کام شیطان کے وسوسہ سے تھا"۔[۲۶]

اس روایت کا مضمون خود ہی اس کے بطلان کی دلیل ہے، حضرت سیدنا آدم علیہ السلام جو خلیفۃ اللہ تھے وہ اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) کیوں رکھتے، یہ اور بھی عجیب بات ہے جو کہ شیطان کی کرامت کا بیان ہے کہ جب بچے کا نام اس کے نام پر رکھا تو وہ بچہ زندہ رہا۔

نفس واحدہ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر آیا ہے، الاعراف آیت ۱۸۹، نساء آیت ۱، الانعام آیت ۹۸، لقمان آیت ۲۸، الزمر آیت ۶۔

زیر بحث آیت میں واحد سے مراد واحد شخصی نہیں بلکہ واحد نوعی ہے، چنانچہ شروع میں اگرچہ تثنیہ کے صیغے ہیں جو مرد اور عورت کے لحاظ سے ہیں اور فعل بھی ماضی ہیں جس سے شبہ ہوتا

ہے کہ یہ گزرے ہوئے خاص واقعہ کا اظہار ہے مگر آخر میں "فتعالی اللہ عما یشرکون" جمع اور حال کا صیغہ آگیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ عام انسانوں کی بات ہے جو ان کی حالی کیفیت سے متعلق ہے، جناب آدم اور حوا کا کوئی خاص گزرا ہوا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے۔[۲۷]

امام قرطبی اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"و نحو هذا مذکور من ضعیف الحدیث فی الترمذی و غیره وفی الاسرائیلیات کثیر لیس لها ثبات"۔

یہ ترمذی کی ضعیف حدیث میں مذکور قصہ ہے اور اسرائیلیات سے ہے، جس میں سے کچھ بھی ثابت نہیں۔[۲۸]

امام رازی نے اس قصہ کو متعدد وجوہ سے باطل ثابت کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے فتعالی اللہ عما یشرکون کہا، یہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ جنہوں نے شرک کیا وہ ایک جماعت ہے۔

۲- اس آیت کے بعد فرمایا أیشرکون مالا یخلق شیئا وهم یخلقون۔[۲۹] (کیا وہ شریک کرتے ہیں انہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بنائے جاتے ہیں) یہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مقصود ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا اور اس آیت میں ابلیس کے بارہ میں کچھ بھی بیان نہیں۔

۳- اگر یہاں ابلیس مراد ہوتا تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے: ایشرکون من لا یخلق شیئا، حالاں کہ آیت اس طرح ہے أیشرکون مالا یخلق شیئا، کیوں کہ عاقل کے لیے "من" کا صیغہ استعمال ہوتا ہے نہ کہ "ما" کا۔

۴- آدم ابلیس کو پہچانتے تھے اور تمام اسما کے عالم تھے، آپ کو یقیناً یہ بھی علم تھا کہ ابلیس کا نام حارث ہے۔

اس علم کے ہوتے ہوئے اور شیطان سے دشمنی اور عداوت کے باوجود یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا یہ نام رکھتے، کیا نام کم ہوگئے تھے کہ اس نام کے علاوہ کوئی اور نام نہ ملا؟[۳۰]

علامہ طبری لکھتے ہیں "کیوں کہ انبیا معصوم ہیں، شرک، گناہ اور شیطان کی اطاعت کا

الزام ان پر نہیں لگایا جاسکتا"۔[۳۱]

امام ابن کثیر لکھتے ہیں "یہ روایت اہل کتاب کے آثار سے ہے"۔

اور رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث صحیح ہے کہ جب اہل کتاب تم سے حدیث بیان کریں تو ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، اہل کتاب کی روایات تین قسم کی ہیں:

۱- جن کا صحیح ہونا کتاب وسنت سے معلوم ہے۔

۲- جن کا کذب کتاب وسنت سے معلوم ہے۔

۳- بعض وہ ہیں جن کا صدق وکذب متعین نہیں۔

اس روایت کا کذب ہمیں معلوم ہے۔[۳۲]

پیر محمد کرم شاہ لکھتے ہیں:

"محققین علمائے کرام کے نزدیک یہ روایت مردود ہے"۔[۳۳]

مسند احمد وغیرہ میں اس قصہ کے ضمن میں نقل ہونے والی روایت متعدد وجوہ سے قابل قبول نہیں۔

(۱) ایک علت تو اس میں یہ ہے کہ وہ "حسن عن سمرۃ" کے طریق سے مروی ہے اور حضرت حسن بصری کا سماع سمرہ بن جندب سے مختلف فیہ ہے۔

حضرت حسن بصری عنعنہ تدلیس کی بنا پر نا قابل قبول ہے۔

(۲) دوسری علت اس کی سند میں یہ ہے کہ اس میں عمر بن ابراہیم ہے اور عمر بن ابراہیم متکلم فیہ راوی ہے۔

(د)

قابیل اور ہابیل کے قصہ میں کتب تفاسیر میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ "وجودِ زن" کا معاملہ تھا، حالاں کہ قرآن کریم نے فقط اتنا ذکر کیا کہ دونوں بھائیوں نے قربانی دی، ان میں سے ایک کی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ قبول ہوئی، دوسرے نے پہلے کو کہا کہ میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا، پہلے نے ایک جامع اصول کا ذکر کر دیا۔

قال انما یتقبل اللہ من المتقین۔[۳۴]

کہ اللہ تعالی صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔

اسی چیز کو قرآن کریم نے دوسرے مقام پر اس انداز میں بیان کیا ہے:

لن ینال اللہ لحومها ولا دمائها ولکن ینا له التقوٰی منکم۔[۳۵]

اللہ تعالی کو ان کے گوشت نہیں پہنچتے اور نہ ان کے خون البتہ اس کے حضور تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔

قتل کے بعد قابیل اپنے بھائی ہابیل کی لاش اٹھائے پھرتا رہا، دو کوے آئے، ایک نے دوسرے کو مارا، قابیل نے کوے کے اس فعل سے دفن کرنے کا عمل سیکھا، اس واقعہ کی تفصیلات معالم التنزیل[۳۶]، روح البیان[۳۷]، روح المعانی[۳۸]، الکشاف[۳۹]، الحسنات[۴۰] میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن کریم نے قربانی کا سبب "وجودِ زن" کو قرار دیا اور نہ دو کوے آنے کا ذکر کیا۔

پیر محمد کرم شاہ قتل کے سبب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قابیل اپنے بھائی ہابیل سے کیوں حسد کرتا تھا، اس کے جواب میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن کوئی یقینی چیز نہیں جسے پیش کرتے وقت دل میں خلش محسوس نہ ہو اس لیے اس سے قطع نظر کرکے صرف وہی کچھ عرض کرنا عبرت کے لیے کافی ہے، جو قرآن حکیم نے بتایا ہے"۔[۴۱]

قتل کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے امام ابن جریر لکھتے ہیں:

"صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور یہ خبر نہیں دی کہ کس کیفیت میں قتل کیا اور نہ رسول کریم ﷺ نے اس کو بیان فرمایا، سو ہمیں اتنا ہی یقین رکھنا چاہیے جتنا رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے"۔[۴۲]

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دعا نہ کرنا

حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں یہ روایت معروف ہے:

"جب حضرت ابراہیم کو نمرود کی جلائی ہوئی آگ میں ڈالا جانے لگا تو حضرت جبرئیل نے آکر عرض کیا: آپ کو کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا، تمہاری

طرف کوئی حاجت نہیں ہے، انہوں نے کہا، پھر اپنے رب سے سوال کیجیے، انہوں نے فرمایا: اس کو میرے حال کا جو علم ہے وہ میرے لیے کافی ہے"۔[۴۳]

اس روایت کے بارہ میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

"اس کو بعض مفسرین کے سوا اور کسی نے ذکر نہیں کیا"۔

امام ابن جریر، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن عساکر اور حافظ سیوطی نے اس واقعہ کو متعدد اسانید کے ساتھ ذکر کیا اور ان تمام روایات میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ جب جبرئیل نے کہا، آپ کی کوئی حاجت ہے؟ تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تم سے کوئی حاجت نہیں اور یہ الفاظ نہیں ہیں "اس کو میرے حال کا جو علم ہے وہ میرے لیے کافی ہے"۔

رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ غالباً اسرائیلیات میں سے ہے اور یہ حدیث معلل ہے کیوں کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اور بہ کثرت احادیث میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی ترغیب اور تلقین کی گئی ہے اور یہ حدیث ان کے مخالف ہے کیوں کہ اس میں ترک دعا کی تصریح ہے اور ہمارے لیے حجت قرآن اور حدیث ہے نہ کہ یہ بے اصل اور معلل روایت۔[۴۴]

علامہ ناصر الدین الالبانی نے بھی اسے اسرائیلی روایت قرار دیا ہے اور کہا ہے "لا اصل له" ابن تیمیہ نے اسے موضوع قرار دیا۔[۴۵]

تعمیر کعبہ

الکعبة المشرفة روئے زمین پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا مرکز اور نماز کے لیے قبلہ ہے، قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اس کی عظمت و شان کا حوالہ متعدد مقامات پر مذکور ہے، اس کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "ان اول بيت وضع للناس[۴۶]" کہ یہ دنیا میں عبادت الٰہی کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے، اس کو قبلہ بنانے کے لیے مصطفیٰ کریم ﷺ کی آرزوؤں کو اس طرح بیان کیا:

قد نرى تقلب وجهك في السماء فلنولينك قبلة ترضها فول وجهك شطر المسجد الحرام[۴۷]

"ہم دیکھتے رہے ہیں بار بار آپ کا منہ آسمان کی طرف کرنا، تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں (لو) اب پھیر لو اپنے چہرہ کو مسجد حرام کی طرف"۔

امام الانبیا ﷺ نے ارشاد فرمایا "میری مسجد میں ایک نماز دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز دیگر مساجد میں ایک لاکھ نماز ادا کرنے سے بہتر ہے"۔[۴۸]

کعبہ کی اسی عظمت و فضیلت کی وجہ سے علما نے اپنی تصانیف میں اس مقدس گھر کے حوالہ سے مختلف معلومات اکٹھی کی ہیں جن میں الازرقی الفاسی[۴۹]، ابن فہد، المحب الطبری، الفاکھی اور ابن اسحاق شامل ہیں، اس موضوع پر لکھنے والوں میں محمد طاہر الکردی[۵۰] اور شیخ حسین عبداللہ باسلامة[۵۱] شامل ہیں، کتب تفاسیر اور سیر میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث موجود ہے، مستشرقین نے بھی اس موضوع پر تحقیقات کی ہیں۔

شعرا نے اس حوالہ سے شعر لکھے، زہیر کا شعر ہے:

فاقسمت بالبيت الذي طاف حوله
رجال بنوه من قريش وجرهم[۵۲]

کعبہ کے احترام کی وجہ سے لوگ اپنی عمارتوں کی مربع شکل نہ بناتے،[۵۳] بدیل بن ورقہ نے سب سے پہلے مربع شکل کا مکان بنایا۔[۵۴]

کعبہ شریف کی اولین تعمیر کے بارے میں چند باتیں تحریر کرنا مقصود ہیں، علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں کعبہ کی تعمیر کے بارے میں لکھا ہے کہ دس مرتبہ ہوئی۔

۱- آدمؑ کی پیدائش سے پہلے فرشتوں نے کعبہ بنایا۔
۲- آدمؑ نے بنایا۔
۳- آپ کے بیٹوں نے تعمیر کیا۔
۴- حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر۔
۵- عمالقہ۔
۶- قبیلہ جرہم کی تعمیر۔

۷- قصی بن کلاب۔

۸- قریش مکہ۔

۹- حضرت عبداللہ بن زبیر۔

۱۰- حجاج بن یوسف ثقفی[55]

لیکن قرآن کریم اور احادیث صحیحہ سے ہمیں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کی اولین تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی، قرآن کریم نے بنائے کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے منسوب کیا ہے اور آپ سے پہلے کعبہ مکہ مکرمہ کا ذکر نہیں ملتا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایسی ساری روایات یہود نے امت محمدیہ کا تعلق ملت ابراہیمی سے توڑنے کے لیے گڑھی ہیں، حضرت سیدنا اسحاقؑ کو ذبیح اللہ کہنا بھی یہودیوں کی انہی سازشوں کی کڑی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ محتاط محققین نے ایسی روایات کو کوئی اہمیت نہیں دی، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حج کے تمام مناسک حضرت ابراہیمؑ ہی سے متعلق ہیں کہ ان مناسک کے حوالہ سے کسی اور نبی کا صحیح روایت میں ذکر نہ ہونا بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کعبہ کے اولین معمار حضرت سیدنا ابراہیمؑ ہیں۔

اس سلسلہ میں علما کی آرا درج ذیل ہیں:

علامہ ابوحیان نے ''البحر المحیط'' میں اس موضوع پر ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا:

وطولوا فی ذلک باشیاء لم یتضحها القرآن ولا الحدیث الصحیح وبعضها یناقض بعضا[56]

یعنی مفسرین نے اس میں ایسے طویل قصے بیان کیے ہیں جو قرآن مجید میں نہیں، کسی صحیح حدیث میں بھی وہ وارد نہیں ہوئے اور ان میں تناقض بھی پایا جاتا ہے، ان روایات میں ضعف کی بنا پر آپ لکھتے ہیں:

ولا ینبغی ان یعتمد الا علی ماصح فی کتاب اللّٰہ وسنۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم[57]

یعنی قرآن اور صحیح حدیث کے سوا کسی دوسری چیز پر اعتماد کرنا مناسب نہیں۔

برصغیر کے نامور محقق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں ''اولاد آدمؑ کی خانہ کعبہ کی تعمیر کے سلسلہ میں وہب بن منبہ سے روایت کیا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کو پانچ مرتبہ تعمیر کیا گیا ہے۔

''سب سے پہلے حضرت شیثؑ نے تعمیر کیا، اس کو ابن عبدالبر نے تمہید میں بیان کیا ہے، دوسری مرتبہ حضرت خلیلؑ نے تعمیر کیا اس کا ذکر قرآن وسنت نبوی ﷺ میں موجود ہے، امیر المومنین سیدنا علی سے مروی ہے کہ سب سے پہلے خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت خلیلؑ نے کی ہے، اسی طرح فاکہی نے اپنی سند کے ساتھ اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جزم کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کسی خبر میں یہ نہیں آیا کہ حضرت خلیلؑ کے گھر سے پہلے یہاں کوئی گھر تھا''۔[58]

حضرت شیخ نے ابن کثیر کی جس تحقیق کا ذکر کیا ہے وہ تفسیر ابن کثیر اور البدایہ والنہایہ میں تفصیل سے درج ہے، امام ابن کثیر کعبہ کی تعمیر کے سلسلہ کی روایات پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ساری روایات اسرائیلیات سے ہیں، نبی کریم ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی روایت ابن لہیعہ[59] کے تفردات سے ہے اور ابن لہیعہ ضعیف ہے یا ہوسکتا ہے روایت موقوف ہو اور عبداللہ بن عمرو بن العاص نے ان کتابوں سے بیان کیا ہو جو انہیں جنگ یرموک میں دو بوریوں میں ملی تھیں''۔[60]

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے کعبہ موجود تھا، جن لوگوں نے لفظ مکان البیت[61] سے اس کو ثابت کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے[62] محمد بن ابوشہبۃ لکھتے ہیں:

''علامہ سیوطی، ازرقی دیگر مورخین ومفسرین نے اس آیت (سورۃ البقرۃ، آیت ۱۲۷) کے تحت خانہ کعبہ کے بارے میں بہت سے قصے نقل کیے ہیں اور انہوں نے صحیح اور غلط میں فرق بھی نہیں کیا''۔

خانہ کعبہ کب بنا؟

حضرت ابراہیم سے پہلے کس نے بنایا؟

حضرت آدم نے اسے تعمیر کیا یا فرشتوں نے؟

ان تمام پہلوؤں پر علامہ سیوطی نے تقریباً دس صفحے لکھے ہیں جن میں سے عشر عشیر بھی مشکل سے صحیح ہے۔[63]

یہی مصنف اپنی سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں ''متواتر آیات اور احادیث صحیحہ جو بخاری میں روایت ہوئیں اور ائمہ نے نقل کی ہیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور آپ کے لخت جگر سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے معاونت فرمائی''۔[64]

ابن عاشور اپنی تفسیر التحریر التنویر میں لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا اور قرآن نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا اور اگر پہلے انبیا میں سے کسی نے بنایا ہوتا تو اس کی شان کی بنا پر قرآن ضرور ذکر کرتا''۔[65]

علامہ آلوسیؒ نے بھی ان روایات کی صحت سے انکار کیا ہے، لکھتے ہیں:

''مورخین نے ایسی بہت سی باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ احادیث صحیحہ سے ان پر روشنی پڑتی ہے، یہ روایتیں بھی متفق نہیں بلکہ ایک دوسری سے متصادم ہیں اور ایک دوسری سے متناقض ہیں، رطب و یابس کہانیوں اور قصوں کو لکھنے کی جو اخباریوں کی عادت ہے، اسی عادت کے نتیجہ میں یہ بے سند باتیں لکھ دی ہیں''۔

مختلف روایات نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں ''اسی طرح کی اور بھی کئی روایات ہیں جو صحیح نہیں ہیں''۔[66]

سیرت حلبیہ میں ہے:

''حق یہ ہے کہ پورا کعبہ صرف تین بار تعمیر ہوا، پہلی مرتبہ ابراہیم علیہ السلام نے بنایا دوسری مرتبہ قریش نے، دونوں کے درمیان دو ہزار سات سو پچھتر (2775) سال کا فاصلہ تھا اور تیسری مرتبہ ہدم کعبہ کے بعد کعبہ کی پوری تعمیر عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمائی، ان دونوں کے درمیان بیاسی (82) برس کا فاصلہ تھا، فرشتوں کی بنائے کعبہ اور آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کی تعمیر کعبہ کا صحیح ہونا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا، قبیلہ جرہم، عمالقہ اور قصی بن کلاب کی بنا پورے کعبہ کی نہ تھی بلکہ وہ جزوی تعمیر اور ترمیم تھی، ہدم کعبہ کے بعد پورے کعبہ کی تعمیر صرف دو مرتبہ

ہوئی، ایک مرتبہ قریش کے زمانہ میں اور دوسری مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دور میں''۔[67]

دور حاضر کے نامور محدث علامہ احمد سعید کاظمی سیرت حلبیہ کی اس عبارت کو نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک بھی یہی اصح اور لائق اعتماد ہے''۔[68]

اس صدی کے نامور مفسر اور سیرت نگار پیر محمد کرم شاہ الازہری اپنی سیرت کی کتاب ضیاء النبی میں علامہ ابن کثیر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحقیق ان الفاظ میں رقم فرماتے ہیں:

''بعض روایات میں ہے کہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے کی لیکن ان روایات کے بارے میں علامہ ابن کثیر کی تحقیق یہ ہے کہ یہ روایات صحیح نہیں، انہوں نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے قرآن وسنت سے استدلال کیا ہے''۔

(یہاں پیر صاحب نے علامہ ابن کثیر کی ''السیرۃ النبویۃ'' ج ۱، ص ۲۷۱، سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، اقتباس نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں):

صحیح حدیث نبوی ﷺ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

''حضرت ابوذرؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی۔

فرمایا: مسجد حرام، پھر عرض کی اس کے بعد۔

فرمایا: مسجد اقصیٰ: پھر پوچھا ان کے درمیان کتنا عرصہ گزرا۔

فرمایا: چالیس سال۔[69]

حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے لکھا ہے:

مگر قرآن کریم نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع کیا اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں۔[70]

حسین عاتق الغریبی نے اپنے مضمون

''الکعبۃ المشرفۃ اول بیت وضع للناس''

میں یہی تحقیق کی ہے۔[71]

امام ابن اسحاق کی ایک روایت میں یہی ہے کہ کعبہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

تعمیر کیا،[۷۲] سرسید احمد خاں نے بھی تعمیر کعبہ کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ثابت کی ہے،[۷۳] رشید رضا مصری نے ان روایات کے تعارض و تناقض، عدم صحت اور ظاہر قرآن کی مخالف ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا ہے، وہ انہیں اسرائیلی خرافات قرار دیتے ہیں جو مسلمانوں میں یہودیوں کی وجہ سے مشہور ہوگئیں،[۷۴] وہ ان کے ذکر کے لیے وقت ضایع کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے،[۷۵] احمد عبدالرحمن البنانے بھی کعبہ کی تعمیر کے بارے میں معروف قصوں کو باطل قرار دیا ہے،[۷۶] عبدالوہاب النجار نے بھی تعمیر کعبہ کا ذکر حضرت ابراہیم کے حوالہ سے کیا ہے،[۷۷] قاضی سلیمان منصور پوری کی بھی یہی تحقیق معلوم ہوتی ہے۔[۷۸]

محققین کی تصریحات کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کعبہ کے معمار اول حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں، البتہ اس حوالہ سے چند اشکالات ہیں، ان کا ازالہ ضروری ہے۔

۱- سورۃ ابراہیم کی آیت ۳۷ سے محمد متولی الشعراوی (تفسیر الشعراوی، ج ۳، ص ۱۶۳۲) نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل موجود تھا کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں تعمیر میں شریک تھے، آیت ۳۷ کا ترجمہ یہ ہے:

"اے ہمارے رب! میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں، اے ہمارے رب! یہ اس لیے تاکہ وہ قایم کریں نماز، پس کردے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مایل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں کا تاکہ وہ تیرا شکریہ ادا کریں"۔

یہ دعا ابراہیم علیہ السلام نے کب کی؟

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ علما کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ دعا تعمیر کعبہ سے پہلے مانگی گئی یا بعد میں، انہوں نے دوسرے قول کی تائید میں قرآن کریم کے ان اشاروں سے استدلال کیا:

۱- رب اجعل ھذا البلد فرماتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ اشارہ حسیہ ہے۔

ب- عند بیتک المحرم۔

ج- الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل واسحاق۔

اور حضرت اسحاق تعمیر کعبہ سے پہلے موجود نہ تھے۔[۷۹]

امام رازی لکھتے ہیں کہ یہ دعا آخری زمانہ میں کی گئی۔[۸۰]

علامہ ابن کثیر کی رائے بھی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کعبہ کی تعمیر کے بعد کی کیوں کہ اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام سے عمر میں ۱۳ سال بڑے تھے۔[۸۱]

علامہ علی بن الواحدی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام ۹۹ (۸۶؟) سال کے تھے اور جب حضرت اسحاق پیدا ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۱۱۲ (۹۹؟) سال تھی۔[۸۲]

پس یہ دعا تعمیر کعبہ کے ایک عرصہ بعد کی گئی کیوں کہ دعا میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا بھی ذکر ہے حالاں کہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرام اسماعیل[۸۳] کو مکہ میں چھوڑا اس وقت حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہی نہ ہوئی تھی۔

۲- اس سے دوسرا اہم اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سورہ آل عمران میں ہے: ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعلمین۔

اس آیت میں اول بیت کا ذکر ہے، للناس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب سے انسان ہیں اس وقت سے کعبہ ہے اور پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اس لیے اس کا وجود آدم علیہ السلام سے پہلے ضروری ہے اور تیسری بات یہ کہ وضع کا فاعل معلوم نہیں وہ فرشتہ ہیں، کیونکہ فرشتے بھی عالمین میں شامل ہیں۔[۸۴]

علامہ متولی الشعراوی نے اس آیت سے جو نتایج اخذ کیے ہیں وہ آیت کے شان نزول سے مطابقت نہیں رکھتے، یہ آیت یہودیوں کے اس اعتراض کے جواب میں نازل ہوئی کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا۔

اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کے مولفین جو کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل ثابت کرتے ہیں،[۸۵] وہ لکھتے ہیں "یہودیوں کے پیغمبر اسلام ﷺ پر دو اعتراض تھے، دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر برتری حاصل ہے، اس کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا جارہا ہے، آیت بتلا رہی ہے کہ اگر کعبہ کو مسلمانوں کے قبلہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ چونکہ روے زمین پر وجود میں آنے والا یہ خدا کا پہلا گھر اور پہلی عبادت گاہ ہے"۔[۸۶]

مولانا مودودی "لکھتے ہیں: "یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المقدس کو

چھوڑ کر قبلہ کیوں بنایا ہے، حالانکہ پچھلے انبیا کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا، اس کا جواب سورہ بقرہ میں دیا جاچکا ہے لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مصر رہے لہٰذا یہاں پھر اس کا جواب دیا گیا ہے، بیت المقدس کے متعلق خود بائبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا (۱-سلاطین، باب ۵، آیت ۱) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں قبلہ اہل توحید قرار دیا گیا (کتاب مذکور، باب ۸، آیت ۲۹-۳۰)، برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں، لہٰذا کعبہ کی اولیت ایسی حقیقت ہے کہ جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں"۔[۸۷]

"للناس" سے بھی استدلال اس وجہ سے درست نہیں کہ قرآن کریم میں یہ لفظ فقط آدم علیہ السلام سے ... قیامت تک کے انسانوں ہی کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک خاص وقت کے لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوا۔

چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱- نزّل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیه وانزل التورٰة والانجیل من قبل هدًی للناس ۔[۸۸]

آپ پر یہ کتاب اس نے حق کے ساتھ نازل فرمائی، تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتری ہیں اور اس نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل اتاری۔

اس آیت مبارکہ میں للناس سے مراد تورات اور انجیل کے مخاطب ہیں نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس زمانہ تک کے لوگ۔

۲- ویکلم الناس فی المهد وکهلا ۔[۸۹]

اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں اور پکی عمر میں بھی۔

یہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گفتگو تمام بنی نوع انسان سے مراد نہیں بلکہ خاص اس زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔

گویا لفظ "الناس" کا تعین سیاق و سباق سے ہوگا، اس لیے ہر جگہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

چوں کہ آدم علیہ السلام انسان اول ہیں، وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ (باقی)

حواشی

۱ المعجم المفهرس لالفاظ القرآن ۲ بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز، ج۶، ص۲۲ ۳ قاموس الکتاب، ص۹۱-۷۹۲ ۴ تفسیر الحسنات، ج۱، ص۱۳۵ و مفاتیح الغیب، ج۳، ص۲۶ و تفسیر مظهری، ج۱، ص۹۷ و الدر المنثور، ج۱، ص۵۳۔ ۵ البقرة: ۳۷ ۶ ضیاء القرآن، ج۱، ص۵۱ ۷ صفوة التفاسیر، ج۱، ص۵۱ ۸ نهج البلاغه، ج۲، ص۱۶۰ ۹ معارف القرآن، ج۱، ص۲۰۱ ۱۰ فصل الخطاب، ج۱، ص۱۱۳ ۱۱ التبیان، ج۱، ص۱۴۹ ۱۲ تدبر قرآن، ج۳، ص۳۳۷ ۱۳ معالم التنزیل، ج۱، ص۶۴/ الجامع لاحکام القرآن، ج۱، ص۳۱۲-۳۱۳/ تفسیر مظهری، ج۱، ص۹۵-۹۶/ المحرر الوجیز، ج۱، ص۱۲۸/ تفسیر عبد الرزاق، ج۱، ص۳۱۶/ جامع البیان، ج۱، ص۳۳۶-۳۳۷ / تبیان القرآن، ج۴، ص۸۳-۸۴ ۱۴ مفاتیح الغیب، ج۳، ص۱۵ ۱۵ تفسیر القرآن العظیم، ج۱، ص...... ۱۶ المراغی، ج۱، ص۹۳ ۱۷ فصل الخطاب، ج۱، ص۱۱۱ ۱۸ تفسیر ماجدی اردو، ج۱، ص۱۸ ۱۹ التبیان، ج۱، ص۱۴۱ ۲۰ طٰه، آیت ۱۲۰ ۲۱ الاعراف، ۲۰ ۲۲ ایضاً، آیت ۲۱ ۲۳ محاسن التاویل، ج۱، ص۲۸۳ ۲۴ قصص القرآن، حصہ۱، ص۳۷-۳۸ ۲۵ الاعراف، آیت ۱۸۹ ۲۶ سنن الترمذی، رقم الحدیث ۳۰۸۸/ مسند احمد، ج۷، رقم الحدیث ۲۰۱۳۷/ المستدرك، ج۲، ص۵۴۵/ جامع البیان، ج۹، ص۱۹۳/ تفسیر مظهری، ج۴، ص۴۴۱-۴۴۲/ معالم التنزیل، ج۲، ص۲۲۱/ تفسیر امام عبد الرزاق، رقم الحدیث ۹۶۸ ۲۷ فصل الخطاب، ج۳، ص۳۸۱ ۲۸ الجامع لاحکام القرآن، ج۴، ص۳۳۸ ۲۹ الاعراف، آیت ۱۹۱ ۳۰ مفاتیح الغیب، ج۱۵، ص۸۶ ۳۱ جامع البیان، ج۴، ص۵۱۰ ۳۲ تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص۳۶۶/ الفتح الربانی، ج۲۰، ص۳۴/ صفوة التفاسیر، ج۱، ص۴۸۷ ۳۳ ضیاء القرآن، ج۲، ص۱۱۲ ۳۴ الاعراف، آیت ۲۷ ۳۵ الحج، آیت ۳۷ ۳۶ ج۲، ص۲۸ ۳۷ ج۲، ص۳۸۹ ۳۸ ج۳، ص۲۸۲ ۳۹ ج۱، ص۶۲۴ ۴۰ ج۲، ص۱۲۵ ۴۱ ضیاء القرآن، ج۱، ص۲۶۰ ۴۲ جامع البیان، ج۶، ص۳۰-۳۱ ۴۳ معالم التنزیل، ج۳، ص۲۱۱ ۴۴ تبیان القرآن، ج۴، ص۱۶۹-۱۷۰ ۴۵ سلسلة الاحادیث الضعیفه والموضوعة، ج۱، ص۲۸-۲۹ ۴۶ آل عمران، آیت ۹۶ ۴۷ البقره، آیت ۱۴۴ ۴۸ صحیح سنن ابن ماجه، ج۱، ص۴۲۱، رقم الحدیث ۱۱۶۳ ۴۹ ازرقی کی کتاب اخبار مکہ اس موضوع پر معروف کتاب ہے۔

۵۰ کتاب کا نام "التاریخ القدیم لمکة و بیت اللہ الکریم" ہے۔ ۵۱ کتاب کا نام "تاریخ الکعبة المعظمة" ہے۔ ۵۲ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ج۶، ص۴۳۹۔ ۵۳ ایضاً ص۴۳۲۔ ۵۴ صبح الاعشی، ج۱، ص۲۸۵۔ ۵۵ ارشاد الساری، ج۳، ص۱۴۳-۱۴۴، اس سلسلہ تعمیر کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج۱۷، ص۳۲۴-۳۲۵/ تفسیر ابن جریر، ج۱، ص۴۲۸-۴۲۹/ الدر المنثور، ج۱، ص۱۲۵-۱۲۷/ فتح الباری، ج۷، ص۲۶۲-۲۶۷/ عمدة القاری، ج۱۶، ص۲۸۸/ دلائل النبوة، ج۲، ص۴۴-۴۵/ سبل الهدی، ج۱، ص۱۴۶-۱۶۸/ معجم البلدان، ج۴، ص۵۲۶-۵۲۷/ روح البیان، ج۱، ص۲۳۲/ تہذیب الاسماء واللغات للنووی، ج۳، ص۱۲۴/ بدائع الزہور فی وقائع الدہور: از محمد بن احمد ابن ایاس حنفی، ص۷۱-۷۲۔ ۵۶ البحر المحیط، ج۱، ص۳۸۷۔ ۵۷ ایضاً۔ ۵۸ مدارج النبوة (اردو ترجمہ مفتی غلام معین الدین)، ج۲، ص۴۷۔ ۵۹ ابن لہیعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں ص۱۱۰/ تہذیب الکمال، ج۱۰، ص۴۵۰-۴۵۷/ تہذیب التہذیب، ج۵، ص۳۷۸-۳۷۹۔ ۶۰ تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۵۰۰۔ ۶۱ سورة الحج کی آیت ۲۶ کی طرف اشارہ ہے۔ ۶۲ البدایہ والنہایہ، ج۱، ص۱۸۲۔ ۶۳ الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر، ص۱۶۸۔ ۶۴ السیرة النبویة فی ضوء القرآن والسنة، ج۱، ص۱۲۵۔ ۶۵ التحریر و التنویر۔ ۶۶ روح المعانی، ج۱، ص۳۸۴۔ ۶۷ سیرت حلبیہ، ج۱، ص۲۷۹-۲۸۰۔ ۶۸ التبیان، ج۱، ص۳۳۳۔ ۶۹ اگرچہ پیر صاحبؒ نے ضیاء القرآن میں عام روایات کے مطابق یہی تحریر کیا تھا کہ کعبہ آدم نے تعمیر کیا (ضیاء القرآن، ج۱، ص۲۵۴) لیکن ضیاء النبی بعد کی تصنیف ہے، (ضیاء النبی، ج۲، ص۱۴۶-۱۴۷)۔ ۷۰ قصص القرآن، ج۱، ص۲۴۰۔ ۷۱ مجلة الحج، جون جولائی ۲۰۰۱ء، ص۳۴۔ ۷۲ الروض الانف، ج۱، ص۱۲۸۔ ۷۳ الخطبات الاحمدیہ، ص۳۱۹-۳۳۱۔ ۷۴ تفسیر المنار، ج۱، ص۴۶۶-۴۶۷۔ ۷۵ ایضاً، ج۴، ص۷۔ ۷۶ الفتح الربانی، ج۲۰، ص۵۸۔ ۷۷ قصص الانبیا از عبدالوہاب النجار، ص۱۳۹-۱۴۰۔ ۷۸ رحمة للعالمین، ج۱، ص۳۸۔ ۷۹ روح البیان، ج۴، ص۴۲۸۔ ۸۰ مفاتیح الغیب، ج۷، ص۱۰۶۔ ۸۱ تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص۵۰۔ ۸۲ الوسیط فی تفسیر القرآن المجید، ج۲، ص۳۴/ علاوہ ازیں البغوی، ج۳، ص۳۸/ زاد المسیر، ج۴، ص۳۶۸/ فتح القدیر، ج۳، ص۱۱۳۔ ۸۳ اردو میں ہاجرہ ہے لیکن عربی میں ہاجر ہی ہے۔ ۸۴ تفسیر الشعراوی، ج۳، ص۱۶۳۰-۱۶۳۱۔ ۸۵ تفسیر نمونہ، ج۱، ص۳۳۰-۳۳۱/ ج۲، ص۲۰۲۔ ۸۶ ایضاً۔ ۸۷ تفہیم القرآن، ج۱، ص۲۷۴۔ ۸۸ آل عمران، آیت ۳-۴۔ ۸۹ ایضاً، آیت ۳۶۔

☆☆☆

فارسی عشقیہ مثنوی نگاری

از:- پروفیسر انوار احمد☆

فارسی کے اصناف شعر میں مثنوی ایک اہم صنف ہے، ابیات مثنوی کے دونوں مصرعے متحد الوزن ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مصرعوں کے قوافی میں بھی ہم آہنگی ہوتی ہے، گرچہ صنف مثنوی کی کوئی خاص بحر مخصوص نہیں تاہم معروف ترین بحریں، بحر متقارب اور بحر رمل ہیں، گشتاسب نامۂ دقیقی اور شاہ نامۂ فردوسی بحر متقارب میں لکھی گئی ہیں، دقیقی سے پیشتر رودکی نے بھی ایک مثنوی اس بحر میں لکھی تھی جو اب ناپید ہے جس کے کچھ اشعار لغات فرس اسدی اور شمس قیس رازی کی تصنیف المعجم فی معاییر اشعار العجم کے ذرائع سے دست یاب ہیں، رودکی سے پہلے ابوشکور بلخی نے اپنی مثنوی "آفرین نامہ" میں اسی بحر کو بروے کار لایا تھا، ایران میں عربوں کے اقتدار سے پہلے بھی یہ بحر مروج و معمول تھی، دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں ابوطاہر خاتونی کے حوالے سے جس شعر کا ذکر کیا ہے وہ بھی بحر متقارب کے قالب میں ہے، شعر اس طرح ہے:

ہژ برا بکیہان انوشہ بدی جہاں را بدیدار تو نہ بدی

نظامی گنجوی سے پیشتر اور بعد کے ادوار میں بہت سے شاعروں نے اس بحر کی تقلید کی، پانچویں صدی میں عیوقی ورقہ وگل شاہ، خواجو کرمانی نے ہماوی ہمایوں، ہاتفی نے تیمور نامہ، نویں صدی میں مادح ہروی نے جہاں گیر نامہ، حسام ہروی نے خاور نامہ اور دسویں صدی ہجری میں حیرتی نے شاہ نامہ، دور قاچاریہ میں صبا کاشانی نے شہنشاہ نامہ، اس بحر میں لکھا، بحر متقارب کے علاوہ، بحر رمل اور بحر ہزج کی مختلف غیر سالم صوتی صورتوں میں بھی بہت سی معروف مثنویاں لکھی گئیں۔

صنف مثنوی کا وجود ایران کی ادبی تاریخ میں نہایت قدیم ہے، فارسی شاعری کے آغاز سے ہی اس صنف سخن کے آثار ملتے ہیں، زین العابدین موتمن، رضا زادہ شفق، زہرائی خانلری اور چند دوسرے

☆ سابق صدر شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، مسکن کوٹھی، باقر گنج گولہ روڈ، پٹنہ-۴۔

ادبی مبصروں نے ابوشکور بلخی کو اولین مثنوی گو شاعر محسوب کیا ہے، ابوشکور چوتھی صدی ہجری کا معروف شاعر تھا، نوح بن نصر سامانی کے دربار سے تعلق رکھتا تھا، محمد عوفی کے قول کے مطابق ابوشکور نے اپنی مثنوی ''آفرین نامہ'' ۳۳۹ھ میں لکھا جس کے کچھ اشعار منتشر و متفرق حال میں اب بھی باقی ہیں۔

آفرین نامہ کے علاوہ شاہ نامہ فردوسی سے پہلے مسعود رازی کا شاہ نامہ معرض وجود میں آیا، یہ چوتھی صدی ہجری کے اوایل کی تصنیف ہے، چوتھی پانچویں اور چھٹی صدیوں میں متعدد مثنویاں ظہور میں آئیں، گشتاسپ نامہ دقیقی اور گرشاسب نامۂ اسدی کے علاوہ عنصری کی مثنوی وامق و عذرا، قطران ارموی کا کوش نامہ، جمالی مہر یجردی کا بہمن نامہ اور عثمان مختاری غزنوی کا شہریار نامہ لایق ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں کچھ ایسی مثنویوں کے وجود کا بھی پتا ملتا ہے جن کے مصنفوں کے اسماو احوال دست برد زمانہ کا شکار ہو کر قعر گمنامی میں جا پڑے ہیں، بیژن نامہ، سہراسپ نامہ، سوسن نامہ اور جمشید نامہ کے مصنفوں کا کچھ پتا نہیں، ساتھ ہی ان ادب پاروں کے ادوار کی بابت بھی کچھ کہنا مشکل ہے۔

اس مقالے کا موضوع حماسی و رزمیہ مثنویات نہیں بلکہ عشقیہ و بزمیہ مثنویوں کا جایزہ ہے، لہٰذا رزمیہ مثنویوں کی شرح و تفصیل یہاں پہ ضروری نہیں، اس ضمن میں شاہ نامۂ فردوسی کی بابت اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ عظیم رزمیہ شاہ کار جنگ و جدال و کشت و قتال کی سچی مرقع نگاری کے باوصف عشق و محبت کی دل انگیز داستانیں بھی اپنی وسعت میں شامل کیے ہوئے ہے، یہ اثر آفریں کہانیاں قمر بانوں کی جاں بازی و فدا کاری، نازنینوں کے غنج و دلال اور رنج و ملال سے بھری پڑی ہیں، منیژہ کی بے بسی، بیژن کی شور بختی، ژال و رودابہ کے جادۂ شوق کی مشکلات و مصایب، خون سیاوش کا المیہ، فرنگیس کی گریہ و زاری، دختر شاہ ہاماوران سودابہ کی ہوس ناکی، بہرام گور کی رامش و نشاط اور سیر و شکار سے معمور سرگزشت، یہ دختران دہقان کا دل فریب جمال و کمال اور تہمینہ کے دل آویز خدوخال کی نہایت جالب تصویر کشی شاہ نامہ میں کی گئی ہے لیکن مکمل و مخصوص صورت میں پہلی عشقیہ مثنوی جو تصاریف روزگار کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ رہ سکی،

عنصری کی وامق و عذرا ہے، اگرچہ یہ مثنوی ایک مدت مدید تک ناپید تھی اور اس کے وجود سے محققین ادب فارسی مایوس ہو چکے تھے لیکن مرحوم پروفیسر شفیع (پنجاب یونیورسٹی، پاکستان) کی تلاش و تحقیق سے یہ گراں قدر رشہ پارۂ ادب دوبارہ ظہور میں آسکا، اس طرح پانچویں صدی کی یہ متاع بیش بہا ایک طویل عرصے کی گمشدگی کے بعد دست یاب ہوسکی، یہ مثنوی پاکستان میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے، وامق و عذرا عنصری کی ایک عاشقانہ مثنوی ہے، عنصری کی پیدایش ۳۵۰ھ میں ہوئی تھی اور ۴۳۱ھ میں اس کی وفات ہوئی، یہ مثنوی شاہزادہ یمن یعنی وامق اور خاقان چین کی دختر عذرا کی عشقیہ داستان ہے، وامق و عذرا بحر متقارب میں لکھی گئی ہے اور محمود بن عثمان لامعی کے ذریعہ اس کا ترجمہ ترکی میں بھی ہوا ہے، بارہویں صدی کے ایک شاعر میرزا محمد صدیق موسوی نے اس داستان کو دوبارہ پیرایۂ شعر سے آراستہ کیا، وامق و عذرا کے چند اشعار بقرار ذیل ہیں:

ابا ویژگان ماند وامق بہ جنگ　　نہ روی گریز و نہ جای و رنگ
بفرمود تا آسنستان بگاہ　　بیامد بنزدیک رخشندہ ماہ
بدو داد فرخندہ دخترش را　　بگوہر بپا راست اخترش را
تنجید عذرا چو مردان جنگ　　ترنجید بر بارگی بیدرنگ

اس مثنوی کے الفاظ و لغات، لہجہ و آہنگ، طرز و روش متقدمین کے سبک شاعری کی نمایند ہے، عربی لغات قلیل ہیں اور ان کی جگہ فارسی کے غریب و نامانوس الفاظ و تراکیب کا غلبہ نظر آتا ہے، مندرجہ بالا ابیات میں بھی غریب الفاظ و اصوات کی مثالیں واضح ہیں، آسنستان وامق کے خسر کا نام ہے، تجیدن و ترنجیدن کے معنی درہم آمدم و درہم کشیدن ہوتے ہیں، ویژگان کا معنی خاصان ہوتا ہے، اس مثنوی میں اشخاص و اماکن کے عجیب و غریب نام آتے ہیں، ماشد، ومیانوس، دانوس، فلاطوس، ویقنوس، مخسوس، متقلوس، بخلوس اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے نام آئے ہیں اور بلاش، کیوس، کروتیل، شامس، لوقاریہ اور اسی طرح کے اور بھی شہروں کے نام اس مثنوی میں ملتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کی ایک عشقیہ مثنوی ''ویس و رامین'' بھی ہے، اس کے مصنف فخر الدین گرگانی ہیں، فخر الدین گرگانی شہر گرگان میں پیدا ہوئے، اس شاعر کا سال تولد صحیح

معلوم نہیں لیکن ''کشف الظنون'' کے وسیلے سے پتا چلتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں متولد ہوئے، گرگانی نے اس معروف داستان کو منظوم پیرایہ میں پیش کرنے کا آغاز ۴۴۶ھ میں کیا اور خواجہ عمید ابوالفتح کی تحریک وتشویق سے یہ شعری شاہکار معرض وجود میں آیا، اس دل کش داستان کی اصل پہلوی زبان میں موجود تھی اور پانچویں صدی کے اوائل میں اپنی شہوائی و دلربائی کے سبب زبان زد خاص وعام تھی۔

''ویس ورامین'' کی بابت دولت شاہ سمرقندی کا یہ خیال غلط ہے کہ یہ نظامی گنجوی یا نظامی عروضی کی تصنیف ہے، مرحوم مجتبیٰ مینوی کی تحقیق سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ''ویس ورامین'' کے مصنف فخر الدین گرگانی ہیں اور دوسرے ذرائع سے بھی ''ویس ورامین'' کی نسبت گرگانی سے واضح ہے، فریدالدین عطار نے بھی اپنی مثنوی الٰہی نامہ میں اس مثنوی کو گرگانی کی تصنیف بتایا ہے، شمس قیس رازی نے بھی اپنی تصنیف ''المعجم فی معاییر اشعار العجم''، میں اس مثنوی کی بابت ایسا ہی اشارہ کیا ہے، ''لباب الالباب'' مصنفہ محمد عوفی جو اسی دور کی تصنیف ہے، سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ''ویس ورامین'' گرگانی کی تصنیف ہے، علاوہ ازیں تاریخ گزیدہ ہفت اقلیم، ریاض الشعرا اور مجمع الفصحا کے مصنفوں نے بھی اس اطلاع کی تائید وتصدیق کی ہے، ایسی صورت میں نویں صدی کے غیر ذمہ دار تذکرہ نویس دولت شاہ سمرقندی کے قول پہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا، ان کا یہ اندازہ خطائے فاحش پہ مبنی ہے، بحر ہزج مسدس محذوف میں لکھی گئی یہ مثنوی تقریباً ۹ ہزار اشعار پر محتوی ہے، اس بحر میں نظامی کی خسرو وشیرین بھی ہے، خسرو وشیرین، وامق و عذرا اور یوسف وزلیخا کے معاشقات کی طرح یہ منظومہ بھی ایک دل فریب معاشقہ کی داستان ہے، عہد اسلام سے قبل سامانیوں کے دور میں بھی یہ داستان مقبول ومروج تھی، مستشرقین اس کے پہلوی ماخذ کو شاپور اول کے عہد سے منسوب کرتے ہیں اور کچھ ایسے بیژن پسر گودرز کے دور کا افسانہ سمجھتے ہیں، صاحب ''ہفت اقلیم'' اس داستان کے واقعات کو شاپور ساسانی سے منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے اشکانیوں کے عہد کی کہانی سمجھتے ہیں، ''کشف الظنون'' کے مصنف کا بھی یہی خیال ہے اور روسی خاور شناس پروفیسر نیوروسکی نے بھی اپنی تحقیقات کی روشنی میں اس خیال کی تائید کی ہے، ''ویس ورامین'' کے شعری محاسن قابل لحاظ ہیں، اس کی تشبیہات کی ندرت اور

مطالب کی زیبائی اور تازگی نہایت دل فریب ہے۔

اس ہیجان انگیز منظومہ کا آغاز شہنشاہ موبد منیکان کا ملکہ شہرو زن قارن پہ فریفتہ ہو جانے کے واقعہ سے ہوتا ہے لیکن ملکہ شہرو شہنشاہ کی آرزوے وصال اپنی پیری وسال خوردگی کے سبب رد کر دیتی ہے، ملکہ شہرو شہنشاہ موبد سے پیمان باندھتی ہے کہ اگر اس کے یہاں مستقبل میں کوئی لڑکی پیدا ہوئی تو اسے وہ شہنشاہ کے حرم میں داخل کر دے گی، چنانچہ ابھی اس واقعہ کو چند ہی سال گزر رہے تھے کہ ضعیفی کے عالم میں شہرو کے یہاں ایک بچی متولد ہوئی جس کا نام ویس رکھا گیا، بچی کو تربیت وتادیب کے لیے ایک دایہ کے حوالے کیا جاتا ہے جو اسے خوزان لے جاتی ہے اور اس کی پرورش وآموزش میں مشغول ہو جاتی ہے، اسی زمانے میں شہنشاہ موبد کی ماں بھی ایک بیٹا جنم دیتی ہے، یہی بچہ رامین کے نام سے موسوم ہوتا ہے، اسے بھی تربیت کے لیے اسی دایہ کے یہاں بھیج دیا جاتا ہے، ویس ورامین کے درمیان انس وعشق کا آغاز دایہ کے سایۂ تربیت میں ہی ہوتا ہے، ویس سرحدِ شباب میں قدم رکھتی ہے، گرگانی کی قدرتِ زبان وبیان کا ایک منظر دیکھیے:

چو قامت برکشید آنِ سرو آزاد   کہ بودش تن ز سیم و دل ز پولاد
خرد در روی او خیرہ بماندی   ندانستی کہ آن بت را چہ خواندی
گہی گفتی کہ این باغ بہاراست   کہ در وی لالہ ہای آبدار است
بنفشہ زلف و نرگس چشم گانست   چو نسرین عارض و لالہ رخانست
گہی گفتی کہ این باغِ خزاں است   کہ در وی میوہ ہای مہرگانست
گہی گفتی کہ ایں گنجِ شہان است   کہ در وی آرزو ہای جہان است
رخش زیبا و اندامش حریراست   دو زلفش غالیہ گیسو عبیراست

وامق وعذرا کے مقابلے میں اس منظومہ کی زبان سلیس تر نظر آتی ہے، اس کا شیوۂ بیان موضوع معاشقہ کے لیے زیادہ شایستہ ہے، قدیم فارسی کی ترکیب وساخت، لغات ولفظیات کی غرابت وثقالت کا احساس کم ہوتا ہے، یہ مثنوی وزن وطرز اور موضوع کے لحاظ سے نظامی کی ''خسرو وشیرین'' سے مشابہ ہے، معاشقات کا بیان گرگانی نے نہایت دل فریب انداز میں کیا ہے، ویس ورامین کے وصل وملاقات کے مناظر نہایت دل انگیز ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کی ایک عشقیہ مثنوی عیوقی کی ورقہ وگل شاہ بھی ہے، یہ منظومہ سلجوقی دور میں مرتب ہوا، بعد کے ادوار میں بھی کچھ شاعروں نے اس داستان کو شعری صورت میں پیش کیا ہے، عیوقی نے اس مثنوی کو بحر متقارب میں لکھا ہے، چند اشعار اس طرح ہیں:

کجا رفتی ای دل گسل یار من　مگر سیر گشتی ز دیدار من
بجستم بتا هرگز آزار تو　چرا جُستی ای دوست آزار من
چگونست بی من بتا کار تو　که باجان رسید از عنا کار من
زمن زار تر گردی اندر فراق　اگر بشنوی نالۂ زار من
برِ تست زنهار جان و دلم　نگهدار زنهار زنهار من

پانچویں صدی ہجری میں سلالۂ سلجوقیہ کے بادشاہ طغان شاہ پسر الپ ارسلان کے ایک معاصر سخن سرا نے ایک عاشقانہ مثنوی ''یوسف وزلیخا'' لکھی، اس مثنوی کا انتساب چارلس ریو کتابدار موزۂ انگلستان اور شارل شفر ناشر ''سفرنامہ ناصر خسرو'' نے فردوسی سے کیا ہے، جشن ہزارۂ فردوسی کے موقعہ پر پڑھے گئے مقالات جو کتاب کی صورت میں شایع ہو چکے ہیں، ایسے اغلاط و اسقام کی جانب مرحوم مجتبیٰ مینوی نے اپنے گراں قدر مقالے میں مدلل طور پہ اشارہ کیا ہے، یہ مثنوی داخلی شواہد کی روشنی میں بھی فردوسی کی تصنیف نہیں ہوسکتی، نویں صدی ہجری تک کسی نے اس مثنوی کو فردوسی سے منسوب نہیں کیا، اسی صدی میں حافظ ابرو نے اپنی مشہور تاریخی تصنیف ''زبدۃ التواریخ'' لکھی اور اس مثنوی کے بہت سے اشعار اپنی تاریخ میں شامل کیے لیکن مصنف کے نام کی اطلاع نہیں دی، یہاں تک کہ عبدالرحمن جامی جنھوں نے اپنی مثنوی ''یوسف وزلیخا'' ۸۸۸ھ میں اختتام کو پہنچایا، فردوسی کی یوسف وزلیخا کی اطلاع نہیں رکھتے تھے، صاحب ہفت اقلیم کا قول ہے کہ عمعق بخاری سے پہلے کسی نے بھی اس احسن القصص کو سلک شعر میں نہیں پرویا، ماحصل یہ کہ ''یوسف وزلیخا'' تحقیق کی روشنی میں طغان شاہ کے ایک معاصر شاعر کی تصنیف ہے اور اس کا انتساب فردوسی سے یکسر نادرست ہے۔

اس مثنوی کے ابیات سست و بے مزہ ہیں اور واضح طور پہ فردوسی کی فنی رفعت و عظمت سے خالی ہیں، یہاں نہ وہ ادبی لطائف ہیں اور نہ افکار وخیالات کے لعل و گہر، چند اشعار جو اس

گمنام شاعر کے اچانک دریا میں گر جانے سے متعلق ہیں، اس طرح ہیں:

بہاراں سوی رود زریں شدم　زبہر نشاط و بالین شدم
بماندم گرفتار گرداب سخت　تو گفتی کہ برگشت بیدار بخت
چو آگاہ شد برسر من دوید　بمویم گرفت و مرا برکشید
پس از خواست دادار یزدان پاک　شد ایں از و جاں من از ہلاک

چھٹی صدی کے معروف ماوراءالنہری شاعر عمعق بخارائی نے بھی داستان یوسف وزلیخا کو منظوم کیا تھا، لیکن اس مثنوی کے اشعار اب نہیں ملتے، عمعق کا وطن بخارا تھا، تحصیل علم وادب کے بعد وہ سمرقند چلے آئے، آل خاقان کے دربار میں رسائی حاصل کی اور خضر خاں ابراہیم کے دربار میں ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا، عمعق کی وفات ۵۴۳ھ میں ہوئی، خدائے سخن حکیم نظامی کا گنجینہ مخزن الاسرار، خسرو وشیرین، لیلیٰ ومجنوں، ہفت پیکر اور سکندر نامہ سے مرکب ہے، نظامی کی مثنویات کے اس مجموعے کو خمسہ کہتے ہیں، اس کی تکمیل میں پینتالیس[۴۵] سال سے کچھ زیادہ ہی مدت صرف ہوئی، مختلف مطبوعہ نسخوں کی بنیاد پر خمسۂ نظامی کے اشعار کی تعداد بتیس[۳۲] ہزار کے قریب پہنچتی ہے۔

نظامی داستان سرائی کے ہنر میں دوسروں کے پیش رو ہیں، ان کی مثنویاں داستان سرائی کے حسن ودلربائی کے ساتھ مطالب اخلاقی اور حکیمانہ پند وموعظت کے گہرہائے گراں مایہ سے متصف ہیں، خمسہ کی تین مثنویاں، خسرو وشیرین، لیلیٰ ومجنوں اور ہفت پیکر عاشقانہ رنگ کی مثنویاں ہیں، خسرو وشیرین اور لیلیٰ ومجنوں کی شورانگیز داستانیں سرزمین ایران اور صحرائے عرب میں نہایت مقبول ومشہور تھیں، خسرو وشیرین کی کہانی ایران کی داستان ہای کہن کا حصہ تھی، فردوسی نے بھی شاہنامہ میں خسرو وشیرین کی داستان لکھی ہے لیکن نظامی کی منظوم داستان زیادہ مفصل ہے، یہ مثنوی تقریباً سات ہزار اور سات سو ابیات پر مشتمل ہے، بحر ہزج مسدس محذوف یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے، گرگانی کی مثنوی ویس ورامین کا بھی یہی وزن ہے، خسرو وشیرین کی داستان میں خسرو پرویز اور اس کے پدر ہرمز کے واقعات، بہرام چوبین اور خسرو کی جنگ، خسرو کی روم میں پناہ گزینی، قیصر روم سے کمک حاصل کرنا، بہرام چوبین

سے دوسری بار جنگ آزما ہونا، خسرو کا فاتح ہو کر تخت نشین ہونا وغیرہ شامل ہیں، لیکن اس منظومہ کے نغز و دلفریب اجزا وہ ہیں جن میں مہین بانو کے کشور ارمنستان کی طرب انگیز سرزمین کی توصیف، خسرو و شیرین کے عشق کے مراحل و مقامات، فرہاد کی درد سے بھری ہوئی داستان، خسرو و شکر کے معاشقات، عیش و نشاط کی مجلسوں کے مناظر اور بارید و نکیسا کی عاشقانہ زمزمہ سنجی کے واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

مثنوی خسرو و شیرین الفاظ و ترکیبات کی سلاست و شیرینی، معانی و مضامین کی لطافت اور استعارات و تشبیہات کی دل آویزی لیل و نہار کے مناظر، بہار و بوستان کی مصوری اور عشق و الفت کے معاملات کی تفسیر و تشریح کے لحاظ سے خمسہ کی بہترین مثنوی تصور کی جاسکتی ہے، اس مثنوی کی بابت نظامی کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

در ایں مشکیں صدفہای نہانی　بسی درہا کہ بینی از نہانی
نو آبستن پردہ ای بینی دلآویز　نوای او نوازش ہای نوخیز
کہن کاران سخن پاکیزہ گفتند　سخن بگزار مروارید سُفتند
چو دانستم کہ دارد ہر دیاری　زمہر من عروسی در کناری
طلسم خویش را از ہم گسستم　بہر بیتی نشانی باز بستم
نظامی نیز کہ این منظومہ خوانی　حضورش در سخن یابی عیانی
نہاں کئی باشد از تو جلوہ سازی　کہ در ہر بیت گوید با تو رازی
پس از صد سال اگر گوئی کجا او　زہر بیتی ندا خیزد کہ ہا او

خسرو و شیرین کے علاوہ اس مثنوی کے اہم کردار مندرجہ ذیل ہیں:

مہین بانو عمۂ شیرین جس کا نام شمیرا تھا

شمیرا نام دارد آں جہانگیر　شمیرا را مہین بانو است تفسیر

ملکہ مہین بانو ارمنستان، بردع اور موقان کے خطوں پہ حکومت کرتی تھی، شاپور خسرو پرویز کا ندیم جس نے اسے شیرین کے حسن و جمال اور کشور ارمنستان کی بابت اطلاع دی، فرہاد کوہکن، بے نظیر معمار مہندس، جس نے شیرین کے ایما پہ قصر شیرین تک شیر پہنچانے کے لیے کوہستان

میں ایک نہر کھود ڈالی، پھر خسرو کی تحریک پہ کوہ بیستوں کی کھدائی میں مشغول ہو گیا، وصل شیرین کی آرزو میں برسوں کوہ کنی میں لگا رہا یہاں تک کہ خسرو کی جانب سے بھیجی ہوئی جھوٹی خبر پا کر تیشہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

مریم: ہم سر خسرو، شہنشاہ روم کی دختر، اس کی زندگی میں خسرو، شیرین کے وصال سے محروم رہا۔

بزرگ امید: خسرو کا وزیر دانش مند، اس کے حکمت آمیز نکتوں کو نظامی نے داستان کے آخری مرحلے میں پیش کیا ہے۔

نکیسا و بارید: دونوں بے مثال مغنی و نوازندے تھے، اپنے ساز و آواز کے وسیلے سے عاشق و معشوق کے مدعا و مقصود کو ظاہر کرتے تھے۔

خسرو و شیرین دلربا اور اثر آفرین کہانی کے ساتھ، افکار و معانی کے بیش قیمت موتیوں کا بھی خزانہ ہے، توحید ایزد متعال، معراج سرور کائنات کے موضوعات کو نظم کرنے میں شاعر کا اوج تخیل لایق تحسین ہے، اخلاقی اور فلسفیانہ نکات سے متعلق اشعار اس مثنوی میں کثرت سے ملتے ہیں، مثلاً موتوا قبل ان تموتوا کی بابت مندرجہ ذیل اشعار سنیے:

ز جان کندن کسی جان برد خواہد　کہ پیش از دادن جان مرد خواہد
نمانی گر بماندن خوبگیری　بمیران خویشتن را تا نمیری

ستم کار خود دوسروں کے جور و تعدی میں گرفتار ہو جاتا ہے:

بچشم خویشتن دیدم برگزر گاہ　کہ زد بر جان موری مرغکی راہ
ہنوز از صید منقارش نپر داخت　کہ مرغی دیگر آمد کار او ساخت
چوں بد کردی مباش ایمن ز آفات　کہ واجب شد طبیعت را مکافات

دنیا کے لیے رنج و غم اٹھانا مناسب نہیں کیوں کہ انجام کار موت ہے، یہ دنیا ناپائیدار ہے:

درین ہستی کہ یابی نیستی زود　نباید شد بہ ہست و نیست خش نود
بسا پیکر کہ گفتند آہنین است　بہ صد خواری کنون زیر زمین است
کجا جمشید و افریدون و ضحاک　ہمہ در خاک رفتند ای خوشا خاک

سخن کی خوبی یہ ہے کہ اس میں الفاظ کم ہوں مگر معانی سے پُر ہو:

سخن کان از سر اندیشہ ناید — نوشتن را و گفتن را نشاید

سخن بسیار داری اندکی کن — یکی را صد مکن صد را یکی کن

مثنوی مجالس و مناظر کی توصیف کے لیے امتیازی حیثیت رکھتی ہے، شیریں کی عفت و پاک دامنی، شب زفاف میں خسرو کی عشق بازی، تادمِ مرگ شیریں کی وفاداری، اس کی خودکشی وغیرہ کی توصیفات نہایت اثر آفریں ہیں۔

خمسۂ نظامی کی تیسری مثنوی لیلیٰ مجنون ہے، تقریباً پانچ ہزار ایک سو ابیات پہ حاوی ہے، یہ مثنوی، بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مفعول مفاعلن فعولن کے وزن میں لکھی گئی ہے، عرب کے معروف عاشق قیس بن عامر اور لیلیٰ کی عشقیہ داستان ہے، نظامی سے پہلے کسی ایرانی شاعر نے اس داستان کو اپنا موضوع نہیں بنایا، لیکن نظامی کے بعد متعدد شاعروں نے اس کی تقلید کی، لیلیٰ مجنوں کی پیروی جن شاعروں نے کی ہے ان میں امیر خسرو دہلوی، جامی، ہاتفی، ہلالی، ضمیری اور مکتبی شیرازی زیادہ شہرت رکھتے ہیں، نظامی نے اس مثنوی کو چار ماہ سے کچھ کم ہی مدت میں مکمل کرلیا تھا، خود کہتے ہیں:

ایں چار ہزار بیت اکثر — شد گفتہ بہ چار ماہ کمتر

گر شغل دگر حرام بودی — در چاہ دہ شب تمام بودی

مثنوی کے اختتام کی تاریخ کی بابت کہتے ہیں:

آراستہ شد بہ بہترین دال — در سلخ رجب بہ ثی و فی دال

تاریخ عیاں کہ داشت با خود — ہشتاد و چہار بعد با بعد

یعنی ماہ رجب ۵۸۴ھ میں یہ مثنوی اختتام کو پہنچی، خسرو و شیریں کی طرح لیلیٰ مجنوں بھی ایک عاشقانہ مثنوی ہے، لیکن خسرو و شیریں کی مجلسوں کی توصیفات عیش و رامش لیلیٰ مجنوں میں نہیں ملتی، کیوں کہ داستان لیلیٰ مجنوں میں ابتدا سے ہی محرومی و نخروتی اور فرقت و فلاکت کے واقعات ملتے ہیں، عاشق و معشوق کے درد و کرب، آہ و اشک اور نالہ و شیون کے بیانات اس مثنوی کا امتیازی وصف ہے، داستان کا اختتام نہایت غم انگیز اور حزن آور ہے، لیکن داخلی کیفیات کی

تشریح، عاشق و معشوق کے راز و نیاز کا بیان نہایت شاعرانہ ہے، نظامی نے اس مثنوی کو نہایت مختصر وقت میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا، اس کی فضا ایران کا لالہ زار نہیں بلکہ عرب کا ریگ زار ہے، یہاں سلاطین ساسانی کے کاخ و بوستان نہیں، تیسفون، ہمدان اور اصفہان کے حسین مناظر نہیں بلکہ کھلے آسمان کے نیچے خیموں کی قطاریں ہیں جہاں ریگ کے ذرے گرم و سوزناک ہواؤں کے بہاؤ کے ساتھ اڑتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خارجی اوضاع کا بیان زیادہ خیال انگیز نہیں ہے، نظامی کی چوتھی مثنوی ہفت پیکر ہے، اس عاشقانہ و رومانی مثنوی کے نام ہفت گنبد اور بہرام نامہ بھی ہیں، نظامی نے اس مثنوی کے آغاز کے بابت کہیں اشارہ نہیں کیا لیکن مثنوی کے اختتامیہ کے دو شعروں سے ان کی تاریخ اختتام کا پتا چلتا ہے، اشعار اس طرح ہیں:

از پس پانصد و نود و سہ بیر آں — گفتم ایں نامہ را چو ناموران

روز ہر چاردہ ز ماہ صیام — چار ساعت ز روز رفتہ تمام

یعنی یہ مثنوی ۱۴ر ماہ صیام ۵۹۳ھ کو اختتام پذیر ہوئی، بحر خفیف مجنون و مقصور بوزن فاعلاتن مفاعلن فعلات میں مثنوی لکھی گئی ہے، نظامی کے پہلے چوتھی صدی کے معروف شاعر ابوشکور بلخی نے بھی ایک مثنوی اس بحر میں لکھی تھی جواب ناپید ہے، نظامی کے ہم عصر شاعر حکیم سنائی نے اپنی مشہور مثنوی حدیقۃ الحقیقت اسی بحر میں لکھی تھی، اس کے علاوہ سنائی نے سیر العباد الی المعاد، کارنامۂ بلخ اور طریق التحقیق کو بھی اسی بحر میں نظم کیا تھا، نظامی کے بعد متعدد شاعروں نے اپنی شعری تخلیقات کے لیے اس بحر کا انتخاب کیا جن میں امیر خسرو دہلوی، جامی، اوحدی، مراغی اور ہلالی لائق ذکر ہیں، ہفت پیکر کا موضوع سلسلۂ ساسانی کے چودھویں بادشاہ بہرام گور کی مجالس نائے و نوش، عیش و نشاط اور سیر و شکار کا شرح و بیان ہے، بہرام گور کی کیف و سرمستی سے معمور زندگی ایرانی داستانوں کا موضوع رہا ہے، ہفت پیکر کے مضامین نہایت لطیف و بدیع ہیں، نازک و دل انگیز تشبیہات سے یہ خیالی منظومہ مملو ہے، معانی کی دقت، مضامین کی رقت، فلسفیانہ اشارات، بزم ہائے سرور و نشاط کی دل فریب توصیفات کی بنا پر کچھ مبصروں کی نظر میں یہ نظامی کی بہترین مثنوی ہے، وحید دستگردی کا انتقادی اشار محتاط ہے، وہ خسرو و شیریں اور ہفت پیکر کو زیبائی، شیوائی اور محسنات شعری کے اعتبار سے مساوی خیال کرتے ہیں۔

نظامی علم ہیئت و نجوم سے آگاہ تھے، اس داستان میں ہیئت و نجوم کے اشارات و اصطلاحات بہت ملتے ہیں، اس مثنوی کا نام نظامی نے "ہفت پیکر" علم ہیئت و نجوم سے اپنی آگاہی کی مناسبت سے رکھا ہے، اس افسانوی منظومہ کو نظامی نے سبعہ سیارہ سے منسوب کیا ہے، بہرام نے ہفت اقلیم کی شاہزادیوں کے لیے ہفت گنبد بنوائے تھے، ہر گنبد کا رنگ جدا جدا تھا، ہفتہ کے ہر روز کے عیش و طرب کے لیے گنبد مخصوص تھا، مثلاً شنبہ کا روز ستارۂ زحل سے منسوب ہے، ستارۂ زحل کی طبیعت سے رنگ سیاہ موافقت رکھتا ہے اور ملک ہند ستارۂ زحل کے زیر سایہ ہے، لہٰذا شنبہ کے روز بہرام گور جامۂ سیاہ زیب تن کرتا تھا اور گنبد سیاہ میں داخل ہوتا تھا جہاں مملکت ہند کی شاہ زادی حریر سیاہ میں لپٹی ہوئی اس کا انتظار کرتی تھی، ہفت گنبد ہفت سیارہ کے مزاج کے مطابق بنائے گئے تھے:

ہفت گنبد درو آں مانده   کرده بر طبع ہفت سیاره
رنگ ہر گنبدی ستاره شناس   بر مزاج ستاره کرده قیاس
گنبدی کو ز نم کیوان بود   در سیاہی چو مشک پنہاں بود
وانکہ بودش زمشتری پایہ   صندلی داشت رنگ پیرایہ
وانکہ مریخ بست پر کارش   گوہر سرخ بود در بارش
وانکہ از آفتاب داشت اثر   زرد بود از چہ از حمایل زر
وانکہ از زیب زہره یافت نوید   بود روشن چو روی زہره سپید
وانکہ بود از عطاردش روزی   بود پیروزه گون زہیر و زی
وانکہ مہ کرده لوی برجش راه   داشت سر سبزیٔ بطالع شاه

مجتبیٰ مینوی کی نظر میں یہ داستان وحدت موضوع کی خصوصیات سے یکسر خالی ہے، مثنوی کے نصف اول میں بہرام گور کی شخصیت و سرگزشت موضوع سخن ضرور ہے لیکن متفرق حکایات کے سہارے بہرام گور کی کردار نگاری کی گئی ہے لیکن کسی داستان کے واقعات میں ربط و تنظیم کی بڑی اہمیت ہے جس کی یہاں واضح کمی نظر آتی ہے، داستان کا نیمۂ دوم سات حکایات پہ مشتمل ہے جو بہرام گور کی سات ملکائیں، اس کی دل داری و دل جوئی کے لیے بیان کرتی ہیں، یہ کہانیاں

متفرق ہیں، ان میں ارتباط نہیں، ان کہانیوں کو بہرام گور کی سیرت و شخصیت سے کوئی تعلق نہیں، مجتبیٰ مینوی کے خیال میں کہانیوں کی یہ افتراقی صورت اس منظومے کا فنی نقص ہے، مجتبیٰ مینوی کا یہ اعتراض یکسر بیجا نہیں لیکن یہ مثنوی کسی مخصوص عاشق و معشوق کی داستان نہیں، اس لیے اسے عشقیہ مثنوی کے عوض افسانوی یا خیالی مثنوی کہنا مستحسن ہوگا، اس مثنوی کے اہم کردار خود بہرام گور اور ہفت اقلیم کی ہفت شاہ زادایاں ہیں، مثنوی کے نیمۂ دوم میں بہرام گور کا کردار مجہول و انفعالی ہے، یہاں بہرام کے سیر و شکار، مخاطرات و معاشقات کا ذکر نہیں، یہاں بہرام کا عمل شکرلب و شیریں دہن حسیناؤں سے ہوش ربا اور خوابناک کہانیاں سننا ہے اور کہانی کے اختتام پہ رات کے پچھلے پہر کیف آور شراب کے جام پی کر ان کے پہلو میں محو خواب ہو جاتا ہے، ان کہانیوں میں جو خیالی کردار آئے ہیں وہی اس مثنوی کے کردار ہیں، ان کہانیوں کے اندر بہرحال ربط و تناسب موجود ہے، داستان سرا کے مقصد و مراد پر اگر نگاہ رکھی جائے تو یہ منظومہ فنی اعتبار سے درست ہے۔

خمسۂ نظامی کے مقلدوں کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں امیر خسرو سر فہرست ہیں، امیر خسرو کے علاوہ جن شاعروں نے نظامی کی تقلید کی ان میں خواجو کرمانی، جلال خراہانی، کاتبی ترشیزی، عبدالرحمٰن جامی، ہاتفی، مکتبی شیرازی، زلالی خوانساری، فیضی، عرفی، نوعی خبوشانی شامل ہیں۔

نظامی کا خمسہ بلاشبہ ان کے فکر و فن کی عظمت کا آئینہ دار ہے، ان کا یہ ادبی شاہ کار ایران و بیرون ایران کے دانش وروں کی نظر میں قدر و وقعت کا موضوع رہا ہے، خمسہ کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ تقریباً سو برس تک کسی شاعر نے اس پیروی میں قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی، سو سال کی مدت کے بعد طوطی شکر مقال امیر خسرو دہلوی خمسۂ نظامی کی پیروی میں اپنی پانچ مشہور مثنویاں مطلع الانوار، شیرین خسرو، مجنوں و لیلیٰ، آئینۂ اسکندری اور ہشت بہشت کو معرض وجود میں لائے، خسرو نے اپنے ان منظومات کا نام "پنج گنج" رکھا، پنج گنج کے مجموعے کی پہلی مثنوی "مطلع الانوار" کو خسرو نے ۶۹۸ھ میں مکمل کیا تھا، اس سے پہلے امیر خسرو ایک باکمال غزل گو کی حیثیت سے ہندو ایران میں مشہور ہو چکے تھے، خسرو کے دیوان غزلیات کے پانچ طبقات ہیں، ہر طبقہ کے محتویات کا تعلق حیات خسرو کے ایک خاص دور سے ہے، مثلاً تحفۃ الصغر دور نوجوانی کی تصنیف ہے، اس میں ۶۶۴ھ سے ۶۸۶ھ تک کے اشعار شامل ہیں، اس کے بعد وسط الحیات کی غزلیں

ہیں، یہ ایام جوانی کی سخن سرائی ہے، اس میں ۶۷۶ ھ سے ۶۸۹ ھ تک کے اشعار ہیں، اسی طرح بقیہ حصے غرۃ الکمال بقیۃ النقیہ اور نہایت الکمال افزونی عمر کی مناسبت سے حیات امیر خسرو کی ایک مخصوص مدت سے تعلق رکھتے ہیں، صنف مثنوی میں اگرچہ امیر خسرو کی شاعرانہ ہنرمندی، افکار و خیالات کی طرفگی و تازگی کے واضح شواہد یقیناً ملتے ہیں لیکن خدائے سخن کے ایک کامیاب مقلد کی حیثیت میں ہی ان کے مقام و مرتبت کی تعیین کی جاسکتی ہے، مثنویاتِ خسرو میں نغز و شگرف مضامین و معانی کی کمی نہیں پھر بھی ابداع و ابتکار کے لمعات خال خال نظر آتے ہیں، امیر خسرو خود ہی اپنی بیش تر مثنویوں میں تتبع نظامی کا اعتراف کرتے ہوئے عظمتِ نظامی کے آگے عجز و نیاز کا اظہار کرتے ہیں۔

''پنج گنج'' سے قبل امیر خسرو نے اپنی معروف مثنوی ''قران السعدین'' میں بھی نظامی کی تقلید کی تھی، امیر خسرو نے اس مثنوی کو ۶۸۸ ھ میں چھتیس[۳۶] سال کی عمر میں تمام کیا، آغاز مثنوی میں عقیدت و محبت کے ساتھ نظامی کی ستایش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

در ہوش مثنویت در دل است   حل کنم این برتو کہ بس مشکل است
در روشی کز تو نہاید مرو   گفت بدم مثنو و نیکو شنو
نظم نظامی بلطافت چو دُر   وز دُر او سر بہ سر آفاق پُر
پس چو تو کم مایہ و بسیار لاف   دُر شمری مہرہ خویش از گزاف
بگذر از این خانہ کہ جای تو نیست   وین رہ باریک بپای تو منیست
تا بود آوازۂ قمری بباغ   کس ندہد گوش بہ آواز زاغ
نور سخن را نہ بجامی طلب   ہم ز نظامی طلب
لیک اگر پند من آری بگوش   مصلحت آن است کہ باشی خموش

امیر خسرو کی یہ پہلی مثنوی ہے، اشعار مزبور سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ خسرو مثنوی سرائی کے لیے خود کو سزاوار نہیں سمجھتے اور نظامی کے اوج فکر و فن سے مرعوب ہوکر خاموشی کی راہ کو مصلحت تصور کرتے ہیں لیکن پیہم ریاضت و محبت سے امیر خسرو کو اپنے سلیقۂ سخن سرائی پہ اعتماد حاصل ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ اتمام ''قران السعدین'' کے دس ہی سال بعد خمسۂ نظامی کے

اٹھائیس ہزار اشعار کے مقابلے میں صرف تین سال کے عرصے میں ابیات پنج گنج کی صورت میں پیش کیے، تاحدیکہ ''پنج گنج'' کی پہلی مثنوی ''مطلع الانوار'' میں خودستائی اور نظامی کی تحقیق پر بھی آمادہ ہوگئے، جیسا کہ اشعار زیریں سے واضح ہوتا ہے:

کوکبۂ خسرویم شد بلند   غلغلہ درگور نظامی فکند
گرچہ بروختم سخن مہر بست   سکۂ من زہر زرش راشکست

لیکن خود بینی و تعلی کا استیلا کچھ ہی دنوں تک رہا جب طبیعت میں پختگی و رسائی پیدا ہوئی اور ذہن کی جودت و جلاً میں اضافہ ہوا تو نظامی کی تجلیل و تعظیم کرنے لگے، ''شیرین و خسرو'' میں کہتے ہیں:

نظامی کاب حیوان ریخت در حرف   ہمہ عمرش در آن سرمایہ شد صرف
چنان در خمسہ داد اندیشہ را داد   کہ با سبع شدادش بست بنیاد
نظامی خود سخن نا گفتہ نگذاشت   زخوبی گوہری نا سفتہ نگذاشت

آئینۂ اسکندری اور مجنوں ولیلیٰ میں بھی امیر خسرو نظامی کی عظمت و بزرگی کا اقرار کرتے ہیں، کہتے ہیں:

ہنر پرور گنجہ دانای پیش   کہ گنج سخن داشت زاندیشہ پیش
نظر چوں بریں جام صہبا گزاشت   ستد صافی و درد بر ما گذاشت

اور مجنوں ولیلیٰ میں مقاومت کی یارائی نہ رکھنے کا احساس ہے، فرماتے ہیں:

نبود چو فسانۂ تو نامی   بیہودہ چہ لافی از نظامی
میداد چو نظم را بیچ   باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

لیکن امیر خسرو خواہ خود بینی کے نشے میں پڑ کر نظامی کی تحقیر کرتے ہوں یا احتیاط و ہوش مندی کی راہ پہ چل کر عظمت نظامی کی تحسین و تکریم کرتے ہوں، بہر حال منظومہ نگاری میں ان کی ہنرمندی، طباعی، دراکی، پرش تخیل اور ذوق شعری لائق ستایش ہے، خسرو کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کے فضل و کمال کے دایرے میں شاعری کے علاوہ فرہنگ و دانش کے متعدد شعبے شامل ہیں، امیر خسرو خسرو خوباں معانی ہونے کے باوصف ایک مورخ، مغنی، محقق اور ندیم سلاطین بھی تھے، اپنی گوناگوں

درباری مصروفیتوں کے باوجود فنون لطیفہ سے شغف رکھتے تھے اور شعر و شاعری کی جملہ اصناف میں اپنے اعجاز سخن کے جوہر چمکاتے تھے، بہ ایں حال محض تین سال کی مختصر مدت میں خمسۂ نظامی کی اتباع میں "پنج گنج" کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے، مثنویات خسرو کے تمام اشعار نظامی کے شعروں سے بہتر یا ان کے برابر اگرچہ ہرگز نہیں ہیں تاہم اس جامع الکمالات نابغہ نے اپنی اعجازی مثنویوں میں مختلف عنوانات کے تحت ایسے بہت سارے اشعار کہے ہیں جو ناقدوں کی نظر میں شایستۂ تحسین ہیں، امیر خسرو کی پہلی عشقیہ مثنوی جو نظامی کی تقلید میں لکھی گئی "شیرین خسرو" ہے، ۶۹۸ھ میں یہ مثنوی ظہور میں آئی، خسرو و شیرین میں نظامی نے اپنے ذہن و دل کی بہترین صلاحیتوں کو لگایا تھا، یہ مثنوی ان کا حاصل حیات تھی اپنے خونِ جگر سے سینچ کر نظامی نے اس نہال سخن کو پروان چڑھایا تھا، اس کے جواب کی جرأت کرنا آسان نہیں تھا لیکن امیر خسرو نے اپنی طبائی و ذکاوت سے اس کے جواب میں نہایت موقر و مستند مثنوی لکھی، ایک قلیل مدت میں اپنے ذہن و ذوق کی مدد سے جواباً "شیرین و خسرو" لکھی اور اسے ایسے نغز و دلآویز، معنی خیز اور خیال انگیز اشعار سے آراستہ کیا جو آج بھی دانش وروں اور سخن شناسوں کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں، امیر خسرو نے اس مثنوی کے مرحلہ اختتام میں جو اشعار لکھے، ان سے مثنوی کی تالیف کے ارادہ و آرزو پہ روشنی پڑتی ہے، کہتے ہیں:

نظامی کاب حیوان ریخت از حرف   همه عمرش در آن سرمایه شد صرف
دلم دریاست کہ ایں سودا بسر داشت   کہ گل چینم زباغی کوگزر داشت
فراغ دل مرا از صد یکی بود   ہوس بسیار و فرصت اند کی بود
چو بازار تمنا گرم تر گشت   دل از اندیشہ بی آزرم تر گشت
میاں در بستم و جستم بزاری   زبا زوی توکل دست یاری
در آغاز رجب شد فرخ ایں فال   زہجرت شش صد و ہشت و نود سال
دگر پرسی کہ بینش را عدد چیست   چہار الف و چہار است و صد وبیست

امیر خسرو کے قول کے مطابق یہ مثنوی چار ہزار ایک سو چوبیس اشعار پر مشتمل تھی، اگرچہ مرور ایام سے اب صورت یہ ہے کہ کسی ایک نسخے میں تمام اشعار نہیں ملتے، مختلف نسخوں میں اشعار

کی تعداد مختلف ہے۔

شیرین خسرو کی داستان اور اس کے قہرمانوں کے متعلق پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، لہذا اس کی تکرار یہاں غیر ضروری ہے لیکن یہ امر قابل غور ضرور ہے کہ دونوں مثنویوں (خسرو شیرین نظامی اور شیرین خسرو امیر خسرو) کی متون کے مندرجات و محتویات میں کچھ اختلافات نظر آتے ہیں، آغاز داستان سے قبل کے مشمولات دونوں مثنویوں میں تقریباً ایک جیسے ہیں، فقط ایک فرق یہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنی مثنویوں میں وصف معراج سرور کائنات کے فوراً بعد ایک عنوان اپنے پیر طریقت کی مدح سرائی کے لیے قائم کیا ہے جب کہ نظامی کی مثنوی میں ایسے عنوان کے وجود کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، متن داستان میں بیشتر مشترک مضامین کے باوصف نظامی کی مثنوی میں کچھ زاید عنوانات ہیں، مثلاً بزرگ امید کے بتائے ہوئے چالیس نکتے، نشستن خسرو بہ آتش خانہ، درخواب دیدن خسرو پیغمبر اکرم را، نامہ نشستن پیغمبر بہ خسرو اور سی لحن باربد وغیرہ خسرو کی مثنوی میں نہیں ہیں۔

امیر خسرو نے اپنی اس مثنوی میں دیگر مثنویوں کی طرح نہ صرف توحید ایزد متعال، نعت سرور کائنات اور وصف معراج میں اپنے اعجاز سخن کے جوہر چمکائے ہیں بلکہ مثنوی کے جملہ مضامین خسرو کی فنکارانہ تردستی، رفعت تخیل، جودت ذہن اور جدت طبع کے مظہر ہیں لیکن اس مقالے کا نشانہ چوں کہ کسی ایک مثنوی کا مطالعہ نہیں بلکہ عشقیہ مثنویوں کا عمومی جایزہ ہے، لہذا اس مثنوی میں شعر خسرو کے تمام محاسن و مزایا کی قدر و قیمت متعین کرنا محال ہوگا، میں صرف وصف طبیعت اور دیگر احوال و اوضاع کی مصوری کی بابت کچھ کہنا چاہوں گا، امیر خسرو عفت مآب شیرین کی شب فراق کی تصویر کشی کرتے ہیں:

شب تاریک چوں دریای از قیر   بدریا در فکندہ چشمۂ شیر
زجنبیدن فلک بیکار گشتہ   ستارہ در رہش مسمار گشتہ
زظلمت گشتہ پنہاں خانۂ خاک   چو چاہ بیژن و زندانِ ضحاک
غنودہ در عدم صبح شب افروز   بقیر اپناشتہ دروازۂ روز
بگنجِ صبح قفل افگندہ افلاک   کلید گنج را گم کردہ در خاک

مندرجہ بالا شعروں میں سیاہیٔ شب کی عکاسی کے لیے جو تشبیہات، تلمیحات اور کنایات مستعمل ہوئے ہیں وہ نہایت بلیغ و برمحل ہیں، یہ اندھیری رات کولتار کا ایک متلاطم دریا ہے کہیں روشنی کی علامت نہیں، طول شب فراق کے کڑے لمحات کٹنے کا نام نہیں لیتے، ایسا لگتا ہے کہ یہ آسمان اپنی گردش سے باز آگیا ہے، نقل و حرکت کا اسے یارا نہیں، چوتھے اور پانچویں شعر میں بڑی لطافت ہے، خسرو کہتے ہیں کہ اس کالی رات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ سپیدۂ صبح عدم آباد میں اونگھ رہا ہو اور مطلعِ فجر کو کولتار سے پاٹ دیا گیا ہو، آخری شعر کی فکری نزاکت، سہولت و سلاست اور لفظی و معنوی حیثیت قابل توجہ ہے، کہتے ہیں کہ بے رحم آسمان نے خزانۂ صبح کے در پہ تالا ڈال دیا ہے اور کلید کو تیرگی کے خاک دان میں ہمیشہ کے لیے گم کر دیا ہے یعنی اب طلوع صبح محال ہے۔

اب ذرا وزش بادِ نوروز کی کرشمہ کاری دیکھیے، خسرو پرویز قصر شیرین کے در پہ کھڑا ہے، باریابی چاہتا ہے لیکن پیکر ناز و تمکین شیرین بے رخی سے پیش آتی ہے، امیر خسرو بہار و بوستان کی جلوہ سازیوں کی مرقع نگاری سے اس واقعہ کا آغاز کرتے ہیں:

چو بستان تازہ گشت از باد نو روز　　جہان بستد بہار عالم افروز
ز آسیب صبا در جلوہ شد باغ　　بغارت داد بلبل بلبل خانۂ زاغ
ہوا کرد از گل آسیب خزاں دور　　بمشک تر بدل شد گرد کافور
عروس غنچہ را نوشد عماری　　کمر بر بست گل در پردہ داری
بنفشہ سر برآورد از لب جوی　　زمیں گشت از ریاحین عنبریں بوی

بادِ بہاری نے بوستان میں تازگی و طرفگی پیدا کر دی، ہر طرف نکہت و نور پھیلانے والی بہار کا جلوہ ہے، صبا کی چھیڑ نے بوستان کی جلوہ فروشی پہ آمادہ کیا اور عنادل نے زاغوں کے آشیانوں کو اجاڑ دیے، نازنینانِ ناشگفتہ بادِ صبا کے دوش پہ نئے محملوں میں جلوہ افروز ہیں، یہ مثالیں محض مشتی از خرواری کے طور پہ پیش کی جا رہی ہیں، مثنوی ایک پیچیدہ صنف ہے، منتخب اشعار کی روشنی میں مثنوی نگار کے فن کے کچھ ہی پہلوؤں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ان مناظر کے علاوہ شہرود کے کنارے خسرو و شیرین کی بزم آرائیاں محفل خسروی میں شکر کی غزل سرائی، عشق شیریں میں فرہاد کی صحرا نوردی اور گریہ و زاری اور پیرزن ندیمۂ شیرین کی موثر کردار نگاری میں امیر خسرو کی شاعرانہ پُرکاری و سلیقہ مندی کے شواہد ملتے ہیں، اسی طرح شب زفاف، روز عروسی کی توصیف، نازنینانِ عشوہ طراز کی سراپا نگاری اور بوقلمونی صبح و شام کے سحر انگیز مرقعے اس مثنوی میں ملتے ہیں، سراپای شیریں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

دولب ہم انگبیں ہم بادہ در دست　　دو چشم شوخ نی ہشیار نی مست
خمار نرگسش در فتنہ خوئی　　میان خواب و بیداریست گوئی
بھوگان داد بہر جان خراشی　　گہی جان دادی و گہ دور باشی
لبی از چشمۂ حیوان سرشتہ　　ہلاک عاشقان بروی نوشتہ
لبی پُر خندۂ شیریں مہیا　　حیات افزای مردم چوں مسیحا
زمستی زلف او درہم شکستہ　　ہزارانِ توبہ در ہر خم شکستہ
جہاں سوزی چو خورشید جہاں تاب　　میانش تشنہ و برہاش سیراب
بتی کز دیدن آن شکل و رفتار　　ببستی زاہد صد سالہ زنار

درج بالا آخر کے تین شعروں میں لطافت و زیبائی کی ہوش ربا جلوہ سازی، شایستۂ توجہ ہے، شیرین کے شکریں لب اعجاز مسیحائی کی تاثیر رکھتے ہیں، مستیِ شباب نے اس کے گیسوؤں کو برہم و بے اختیار کر رکھا ہے، گیسوؤں کے خم و پیچ نے ہزاروں توبہ و استغفار کو توڑ ڈالا ہے، اس کی رعنائی شعشۂ خورشید کی طرح نظارہ سوز ہے، میانش تشنہ و برہاش سیراب میں نہایت جمیل و جالب خیال پیش کیا گیا ہے جو قوتِ حسی کو دعوت دیتا ہے، موی میان اور لاغر میان کی ترکیبیں تو بہتوں کے کلام میں ملتی ہیں لیکن میان کو تشنہ کہنا اور پھر اس کی مطابقت سے اثمار شباب کو سیراب بتانا غالباً امیر خسرو کا مبتکرانہ خیال ہے۔

آخری شعر میں کہتے ہیں کہ اس کافر ادا، تقویٰ شکن نازنین کی صنم شعاری کو دیکھ کر صد سالہ زاہد اپنی پارسائی و پرہیزگاری کے خرقے کو دور پھینک کر اپنے گلے میں زنار ڈال لے گا۔

الغرض زمان و مکان اور ابتاعی موضوع کی مشکلات و مسایل کا خیال رکھتے ہوئے انتقادی تجزیہ کیا جائے تو امیر خسرو کی یہ عشقیہ مثنوی مجموعی اعتبار سے ایک وقیع کارنامہ ہے اور ان کی شاعرانہ فخامت کی نشاندہ ہے، زبان و بیان کا حسن، قصہ پردازی کا ہنر اور افکار و معانی کا

نیرنگ وفسون نظامی کی مثنوی کے امتیازی عوامل ضرور ہیں لیکن خسرو اقلیم سخن نے بھی اپنے اس جوابی کارنامے میں جملہ التزاماتِ شعری کا حق بوجہ احسن ادا کیا ہے اور اختراع وابتکار کے جالب و چشم گیر نشانات چھوڑے ہیں۔

نظامی کو بہر حال تقدم حاصل تھا، اس کے علاوہ داستان کے محلات وقوع سے تعلق و تقرب کی سہولت انہیں حاصل تھی، خطۂ ارمن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا، مداین کے خرابے سے اپنے ہم عصر خاقانی کی طرح گزرے ہوں گے، کوہ بیستون کی وادیوں سے بہتر طور پہ واقف ہوں گے، ان کی مثنوی ''خسرو وشیرین'' کی عظمت ومزیت کے یہ بھی اسباب ہیں، خسرو وشیرین نظامی کے نیا کان کی داستان ہے، اس کی تصنیف میں نظامی کا ذہن دراک ہی نہیں قلب حساس بھی مشغول ہے، امیر خسرو کا یہ کارنامہ بہر حال تقلیدی موضوع کے مسایل کے اعتبار سے درخور تحسین ہے۔

امیر خسرو کی دوسری عشقیہ مثنوی ''مجنوں ولیلیٰ'' ہے، چوالیس سال کی عمر میں امیر خسرو نے ۶۹۸ھ میں اس عاشقانہ منظومہ کو مکمل کیا، اس وقت تک تحفۃ الصغر، وسط الحیٰوۃ اور غرۃ الکمال کی غزلوں کے مجموعے معرض ظہور میں آچکے تھے، ساتھ ہی مثنوی قران السعدین بھی لکھی جاچکی تھی، دو ہزار چھ سو ساٹھ اشعار پر محتوی یہ مثنوی نظامی کی ''لیلیٰ مجنوں'' کے جواب میں لکھی گئی لیکن اشعار کی مکمل تعداد کسی نسخے میں دست یاب نہیں ہے، صحرائے عرب کی یہ غم انگیز داستان کسی تعارف کی محتاج نہیں، داستان ''مجنوں ولیلیٰ'' کی نوعیت کی بابت مورخوں اور مبصروں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے، کچھ علمائے تاریخ وادب اسے تاریخی واقعہ پہ مبنی سمجھتے ہیں اور کچھ اسے محض افسانہ تصور کرتے ہیں، تمام ادب شناسوں میں ابوالفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی کی بحث سنجیدہ ومحققانہ ہے، ابوالفرج اصفہانی کے قول کے مطابق مجنوں کا نام قیس تھا جو ملوح بن مزاحم کا بیٹا تھا، کچھ مورخوں نے اس کا نام مہدی بھی بتایا ہے اور لیلیٰ ام مالک مہدی بن سعد کی دختر تھی، طریق عشق کے ان رہروں کا موطن ومولد نجد تھا، یہ دردناک داستان مروان بن حکم اموی کے عہد سے تعلق رکھتی ہے، لیلیٰ مجنوں (نظامی) اور مجنوں ولیلیٰ (امیر خسرو) کے محتویات میں قابل لحاظ اختلافات ہیں، بیشتر مشترک عنوانات کے علاوہ خسرو کی مجنوں ولیلیٰ میں کچھ زاید اجزا بھی ہیں،

خسرو کی مثنوی کے مشتملات میں جزیات زیادہ ہیں، نظامی کی مثنوی میں منقبت ''چار یار'' کا بھی ایک عنوان ہے جو ان کے عقیدے کی جانب اشارہ کرتا ہے، خسرو کی مثنوی میں ایسا کوئی باب نہیں، نظامی کی مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن سلام کی بیماری کے بعد لیلیٰ نے زید کے وسیلے سے مجنوں کو بلایا تھا لیکن خسرو کی مثنوی کا ایک عنوان اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ لیلیٰ شدتِ بے قراری میں ناقہ پہ سوار ہوکر دیدار یار کے لیے چل پڑتی ہے، امیر خسرو نے اس مثنوی کے نظم میں بڑی توجہ اور شعری ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے، یہ مثنوی ان کی مخلصانہ ہنروری کا نتیجہ ہے، اس کا اسلوب بیان سلیس وشستہ، نرم ورواں ہے، موضوعات کی شرح وتوضیح نہایت شورانگیز، نہایت جالب وشور انگیز ہے، نظامی کی لیلیٰ مجنوں گرچہ راز ونیاز، سوز وگداز اور حزن وغم میں ڈوبے ہوئے رقت انگیز اشعار سے خالی نہیں ہے لیکن رامش ونشاط اور طرب انگیز مواقع چوں کہ اس حزنیہ داستان میں بہت کم تھے، اس بنا پہ نظامی اس مثنوی کے آغاز میں تردد وبددلی کے شکار ہوگئے تھے، اشعار ذیل میں نظامی اشارہ کرتے ہیں:

میدان سخن فراز باید   تا طبع سوار پی نماید
ایں آیت اگرچہ ہست مشہور   تفسیر نشاط ہست از و دور
افزار سخن نشاط و نازاست   زیں ہر دو سخن بہانہ سازاست
نہ باغ و نہ بزم شہریاری   نہ رود و نہ می نہ کامگاری
بر خشکیٔ رود و سختیٔ کوہ   تا چند سخن رود در اندوہ

ان شعروں سے مترشح ہوتا ہے کہ نظامی داستان سرائی کے لیے باغ وبہار، کیف ونشاط اور شاہانہ محفلوں کی جلوہ سازیوں کو ضروری سمجھتے ہیں جن کے بغیر سخن سرائی کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے، شور وسنگلاخ سرزمین، ریتوں سے بھری ہوئی اس کی بے جان پیاسی وادیاں، شگفتہ شعروں کا موضوع نہیں بن سکتیں لیکن نظامی کا یہ خیال محل نظر ہے، شعر وسخن کا مقصد، تلاشِ حسن وجمال ہے اور یہ حسن جس کی جستجو میں شاعر خونِ جگر پیتا ہے، ذہن وقلب کی تمام قوتوں کو متوجہ ومراقب رکھتا ہے، فطرت کی صرف ایک صورت میں جلوہ افروز نہیں ہوتا، وقت کا ہر تیور اور فطرت کا ہر انداز کسی حساس شاعر کے جذبات کو اکسانے کے لیے کافی ہے، اگر ایران کی شاداب سرزمین، وہاں کے گلہای گوناگوں،

رنگ و بو سے معمور فضا شاعر کو آمادۂ سخن کرسکتی ہے تو صحرائے عرب کی بے برگ وبار فضا، ریگ زاروں میں رقص کرتے ہوئے بگولے، دوپہر کی تمازت، تاریکیٔ شب کی سنگینی بھی شاعر کو متاثر کرسکتی ہے، امیر خسرو اس رمز سے باخبر تھے، انہوں نے نظامی کے خیال سے اتفاق نہیں کیا اور صحرائے عرب کے چادر نشینوں کی اس غم ناک داستان کو خلوص و اعتماد کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا، اس مثنوی کا ہر بیت نازک و نغز مطالب و معانی سے مملو ہے، خسرو کہتے ہیں:

آرایش پیکر معانی بستم به سلاست و روانی

حقایق و معارف، پند و موعظت، نفسانی احوال و کوایف کی واقعہ نگاری اور توصیف فطرت کے موضوعات پر نہایت مستی خیز و دل آویز اشعار اس مثنوی میں ملتے ہیں، درج ذیل شعروں میں خزاں کی تصویر کشی کی گئی ہے، شاعر کی جادو بیانی دیکھیے:

آمد چوں خزاں به غارت باغ بنشست بجای بلبلاں زاغ
رخسارۂ لاله پر ز جبیں گشت آیینۂ آب آہنیں گشت
ہر غنچه که جلوه کرد گستاخ در ریختن آمد از سرِ شاخ
ہر سوی برہنه گلستانی چوں راه فتاده کاروانی
ز آسیب طپانچای صرصر غلطاں به زمیں شگوفۂ تر
منقار کلاغ بر سر گل مقراض شده به پر بلبل

اور اب مہر نیم روز کے قہر و غضب کا منظر دیکھیے:

یک روز بگاه نیم روزاں کانجم شده ز آفتاب سوزاں
جای نه که دیده را برد خواب ابری نه که تشنه را دہد آب
مرغانِ چمن خزیده در شاخ در رفته خزندگان به سوراخ
در حوضه خشک از آتش و آب صد پاره شده زمینِ بی آب
مرغانی در آرزوی آبی خون خورده بگرد ہر سرابی
ریگ از بط پخته در گرانی چوں تابه بروز میہمانی

شاعرانہ ہنرمندی کا ایسا ہی رفیع معیار مثنوی کے تمام حصوں پر اثر انداز ہے، نظامی کی

مثنوی لیلیٰ مجنوں میں بھی معانی کے دل کش نقوش یقیناً ملتے ہیں اور بلاشبہ یہ ایک قدر اول کا کارنامہ ہے لیکن خسرو کی لیلیٰ مجنوں میں فن کاری کے ساتھ ساتھ جو سوز و دردمندی ہے وہ نظامی کی مثنوی میں نہیں ملتی، خسرو کی مثنوی ذہنی ہوشیاری سے زیادہ قلبی رشتے کی بدولت ایک سحر انگیز چیز بن گئی ہے۔

''پنج گنج خسروی'' کی آخری عشقیہ مثنوی ''ہشت بہشت'' ہے، امیر خسرو نے اس مثنوی کو نظامی کی ''ہفت پیکر'' کے جواب میں ۷۰۱ھ میں منظوم کیا تھا، اس وقت ان کی عمر اکاون سال ہو چکی تھی، یہ مثنوی بحر خفیف مسدس مخبون و مقصور فاعلاتن مفاعلن فعلات کے وزن میں لکھی گئی، یہ تین ہزار تین سو پچاس شعروں پہ مشتمل ہے، جیسا کہ درج ذیل شعر سے ظاہر ہے:

سه هزار و سه صد و پنجه آمد همه بیتش بگاه عرض شمار

اس مثنوی کے نام کی بابت یہ بات قابل غور ہے کہ نظامی کی مثنوی کا نام ''ہفت پیکر'' ہے جب کہ خسرو نے ایک عدد کے اضافہ کے ساتھ اس مثنوی کا نام ''ہشت بہشت'' رکھا، میرے خیال میں نظامی کی مثنوی کا نام زیادہ موزوں و مناسب اور مشتملات کے عین مطابق ہے، نظامی ہیئت و نجوم کے رمز شناس تھے، انہوں نے سبعۂ سیارہ کے مزاج و خاصیت کے تنوع کی مناسبت سے اپنی مثنوی کا نام رکھا، سات کا عدد برکت و میمنت کی علامت ہے، یہ عدد روایتی طور پہ ہمیشہ مختلف قوموں اور فرقوں کے درمیان مسعود و مبارک سمجھا جاتا رہا ہے، مثلاً خانۂ کعبہ کا سات بار طواف، ہفت خوان رستم، ہندوؤں کی شادی بیاہ کے مواقع پر پوتر اگنی کے گرد سات پھیرے کی رسم وغیرہ، اس کے علاوہ ہفت اقلیم، ہفت اورنگ اور ہفت دریا کے تصورات قدیم ایام سے چلے آرہے ہیں لیکن عدد ہشت میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں، ہشت بہشت معنوی اعتبار سے درست ضرور ہے لیکن ہفت پیکر میں جو حسن و موزونیت ہے وہ ہشت بہشت میں نہیں، ہر لفظ کے اندر خیالات کی دنیا پوشیدہ ہوتی ہے، لفظ ''پیکر'' نازک و لطیف خیالات کا پیکر ہے، داستان سرائی اور قصہ پردازی کے لیے یہ لفظ زیادہ مناسب ہے۔

لیکن امیر خسرو کو یہ مشکل درپیش آئی کہ انہیں سات ملکوں کی شاہزادیوں کی زبانی کہی گئی سات کہانیوں کو ہفتہ کے سات دنوں سے مطابق کرنا تھا، لہٰذا مجبور ہو کر ہفتہ کے روز اول کی کہانی کو بہشت دوم سے متعلق کر کے داستان سرائی کا آغاز کیا، امیر خسرو کے یہ سات منظوم افسانے نظامی کی داستانوں سے بظاہر مختلف ضرور ہیں لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جن پہ ہفت پیکر کے افسانوں

کا خاصا اثر ہے، گرچہ یہ امیر خسرو کی طبع زاد کہانیاں ہیں، گنبد مشکین میں سنائی گئی پہلی کہانی جو شہر یار سرآندیپ کے تین فرزندوں سے متعلق ہے نہایت مشہور و مقبول ہے، دوسری زبانوں میں بھی یہ کہانی موجود ہے، ہشت بہشت کی دو کہانیاں سرزمین ہند سے متعلق ہیں، ایک گنبد ریحانی کی کہانی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

بود فرمان دہی بہ ہندوستاں   شہر کشور ز عدل او بستاں

دوسری کہانی گنبد گل ناری کی ہے، یہ پانچ ہنر شناس دوستوں کی کہانی ہے جو ملتان سے سفر کرتے ہوئے کامروپ تک جا پہنچتے ہیں۔

ہفت پیکر کی داستانیں اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، نظامی پہلوی و اسلامی ماخذوں کے علاوہ یہودیوں اور نصرانیوں کی کتابوں سے بھی باخبر تھے، ان ماخذ سے نظامی نے استفادہ کیا تھا، ان کی تصنیفات میں ان سے متعلق تلمیحات و اشارات اکثر و بیشتر ملتے ہیں، "شرف نامہ" میں نظامی نے خود کہا ہے:

زہر نسخہ برداشتم مایہ ہا   بر او بستم از نظم پیرایہ ہا
زیادت ز تاریخہای نوی   یہودی و نصرانی و پہلوی

ہفت پیکر کی شروعات میں بھی نظامی نے اس منظومہ کی تشکیل میں مختلف ماخذ و منابع سے استفادہ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں:

باز جستم زمانہ ہای نہاں   کہ پراگندہ بود گرد جہاں
زان سخنہا کہ تازی است و دری   در سواد بخاری و طبری
ہر ورق کاوفتاد در دستم   ہمہ را در خریطہ ای بستم

امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت، ہفت پیکر کی ایک کامیاب تقلید ہے، اس کے باوصف شاعر نے مختلف ابواب میں اپنی انفرادی و اختراعی حیثیت قایم رکھی ہے، گنبدوں کی توصیف اور ان کے رنگوں کی تعریف میں خسرو نے اپنے اندیشہ و ہنر کے محسنات کا مظاہرہ کیا ہے، "گنبد مشکین" کا منظر دیکھیے:

روز شنبہ کہ باد مشک انگیز   شد بہ داماں صبح غالیہ بیز
شہ بہ گنبد سرای مشکیں شد   خانہ زو ہم چو نافۂ چیں شد
جامہ را ہم برنگ کیوانی   داد ترتیب عنبر افشانی

ماہ ہندی نژاد رومی چہر   خاست از خواب گاہ ناز بہ مہر

سراپا نگاری میں تشبیہات واستعارات کی شایستگی در خور ملاحظہ ہے:

خاصہ ترزاں ہمہ کنیز می بود   آفتابی بزیر چرخ کبود
قامتی در خوشی چو عمر دراز   ہوس انگیز تر ز عشق مجاز
روی گلرنگ داد گل را رنگ   دہنش تنگ با شکر ہم تنگ

خسرو نے لایق تحسین حد تک اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے، اپنی ندرت فکر اور قدرت زبان سے اس نے اس مثنوی میں ایک طلسمی کیفیت پیدا کردی ہے، کہانیوں کی یہی کیفیت قاری کی توجہ کو اپنی طرف جلب کرتی ہے۔

"پنج گنج خسروی" میں امیر خسرو کا لہجہ وہی ہے جو ان کے معاصر ایرانی شاعروں کا لہجہ تھا، گرچہ کچھ ناقدین ادب 'سبک ہندی' کا آغاز امیر خسرو کے کلام میں ڈھونڈتے ہیں لیکن امیر خسرو کے کلام میں کوئی واضح و مشخص عوامل نہیں ملتے جو انہیں ایرانی شاعروں کے مقبول مجرائے فکر سے الگ ثابت کرسکتے ہوں، سبک ہندی کی کچھ مبہم علامتیں کسی حد تک امیر خسرو کی غزلوں میں مل سکتی ہیں لیکن ان کی مثنویوں میں ایسے نشانات نہیں ملتے، نظامی اور خسرو کے زبان و بیان کا فرق دراصل زبان کا فرق ہے۔

امیر خسرو کی طبع زاد مثنویوں میں ایک عشقیہ مثنوی "دول رانی خضر خاں" بھی ہے جس کا معروف تر نام "عشقیہ" ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا نام "عاشقیہ" بھی لکھا ہے، خسرو نے اس مثنوی کو خضر خاں کی فرمایش پہ لکھا تھا، یہ مثنوی خضر خاں اور راج کرن والی گجرات کی بیٹی دیولدی کی عاشقانہ داستان ہے، امیر خسرو اس داستان سرائی کی فرمایش کی بابت لکھتے ہیں:

چہ گفت ایں بس نوازش کرد فرمود   کہ ای صد گنج معنی در تو موجود
ز نطقت یک سخن صد لولوی تر   زکلکت یک شبہ صد کان گوہر
ز تو خواہم کہ ایں افسانۂ راز   کہ کرد از رنجہای سینہ درباز
چناں سنجی ز بہر ایں دل تنگ   کہ در میزان دلہا کم شود سنگ
دل مردہ حیات از سر پذیرد   و گر کس زندہ دل باشد بمیرد

بود گاہی غم و اندیشہ یاری مراد عالمی را غم گساری

خسرو نے اس مثنوی کو ۷۱۵ھ میں مرحلہ اتمام تک پہنچایا، اس کی تصنیف میں تقریباً چار مہینے صرف ہوئے لیکن خضر خاں کے قتل کی داستان ۷۱۵ھ کے بعد منظوم کی گئی، اس مثنوی کے کچھ حصے تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں لیکن خسرو نے معاشقات کے واقعات کو نہایت موثر طور پر رشتۂ شعر میں پرویا ہے، خسرو نے اس مثنوی میں واقعہ نگاری کے بہت سارے دل کش نمونے دکھائے ہیں اور ہندوستان کی تہذیب و فرہنگ، رسم و رواج سے متعلق اہم اطلاعات ملتی ہیں، ہندوستان کے موسموں کے کوائف، ملبوسات و ماکولات، سبزہ و گیاہ، زرعی محصولات، گل بوٹے اور میوہ جات کی توصیفیں اس مثنوی میں ملتی ہیں، اس مثنوی میں حکایت کے وسیلے سے پند و موعظت، فلسفہ و حکمت کے بیش بہا نکتے بھی سمجھائے گئے ہیں، اس مثنوی کا طرز بیان نہایت نازک اور رقت انگیز ہے، عاشقانہ معاملات کے بیان میں عاشق و معشوق کی نفسیات کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے، امیر خسرو کی یہ مثنوی بھی ان کی شاعرانہ عظمت کی آئینہ دار ہے، اتباعی مثنویوں کے علاوہ طبع زاد مثنویوں میں بھی خسرو نے اپنے ہنر کے جوہر دکھائے ہیں، یہ مثنوی ان کی طبع زاد مثنویوں میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔

مراجع و منابع

☆ مثنوی 'ویس و رامین' فخر الدین گرگانی، مرتبہ مجتبیٰ مینوی، چاپ تہران ☆ مثنوی 'وامق و عذرا' عنصری بلخی، مرتبہ پروفیسر محمد شفیع، چاپ لاہور پاکستان ☆ مثنوی 'ورقہ و گلشاہ' عیوقی، مرتبہ ذبیح اللہ صفا، چاپ تہران ☆ مثنوی 'ہشت بہشت' امیر خسرو، مرتبہ مولانا محمد سلیمان اشرف، چاپ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مثنوی 'دول رانی خضر خان' امیر خسرو، انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ☆ مثنوی 'ہفت پیکر' نظامی گنجوی، چاپ کارخانہ محمد تقی تہران ☆ مثنوی 'لیلیٰ و مجنوں' نظامی گنجوی، چاپ کارخانۂ محمد تقی تہران ☆ مثنوی 'شیرین خسرو' امیر خسرو، چاپ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مثنوی 'خسرو شیرین' نظامی گنجوی، چاپ تہران ☆ مثنوی 'مجنوں لیلیٰ' امیر خسرو، مطبع نول کشور ☆ 'احوال و آثار نظامی گنجوی' سعید نفیسی، کتاب فروشی فروغی تہران ☆ خسرو نامہ، مجلہ تحقیقات فارسی، انتشار بخش فارسی دانش گاہ، دہلی ☆ بزم مملوکیہ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، معارف پریس اعظم گڑھ ☆ 'امیر خسرو' آثار و احوال، پروفیسر وحید مرزا، ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد ☆ 'تحول شعر فارسی' زین العابدین موتمن، چاپ تہران

☆☆☆

ایلیا ابو ماضی

رابطہ قلمیہ کے ترجمان شاعر

از:- ڈاکٹر عبد الرحمٰن وانی ☆

عرب دنیا میں دور جاہلی سے لے کر دور جدید تک امرؤ القیس، نابغہ ذبیانی، زہیر بن ابی سُلمیٰ، حسان بن ثابت، خنساء، جریر، اخطل، فرزدق، عمر بن ابی ربیعہ، ابوتمام، بحتری، ابو العلاء المعری اور متنبی جیسے قد آور شعرا پیدا ہوئے ہیں، عباسی دور حکومت میں عربی شاعری دنیائے عرب تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ عالم عرب کی حدود سے نکل کر اندلس کی سرزمین تک پھیل گئی جہاں یہ موشحات کی شکل میں بہت پھلی پھولی، گوکہ ہر دور میں عربی شاعری ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور ہر دور کی شاعری کی اپنی ایک علاحدہ خصوصیت اور الگ پہچان ہے لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دور جدید ہی وہ واحد دور ہے جس میں عربی شاعری فن اور تخیل کی عظیم بلندیوں کو پہنچی اور پرانے قیود سے نکل کر ایک نئے پیکر و قالب میں ہمارے سامنے ظاہر ہوئی، محمود سامی البارودی، حافظ ابراہیم، اسماعیل صبری، خلیل مطران، احمد شوقی، عبد الرحمٰن شکری، عبد القادر المازنی، عباس محمود العقاد، نازک الملائکہ اور فدوی طوقان وغیرہ عربی شاعری کو جتنا زندگی کے قریب لائے اتنا کسی بھی دور میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے، اگرچہ مذکورہ شعرا کا اسلوب الگ الگ ہے لیکن سب ہی نے عربی شاعری کو نئے نئے مضامین اور تخیلات سے آشنا کیا اور اسے عالمی ادب کے ہم پلہ بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔

جس زمانے میں عبد الرحمٰن شکری، عبد القادر المازنی اور عباس محمود العقاد مصر میں عربی شاعری میں طبع آزمائی کر رہے تھے اور عراق میں معروف الرصافی اور جمیل صدقی زہاوی جیسے عظیم شعرا کی صدائیں گونج رہی تھیں عین اسی زمانے میں شمالی امریکہ میں عربی ادیبوں کی ایک چھوٹی

☆ لیکچرر شعبہ عربی، کشمیر یونیورسٹی۔

سی جماعت وجود میں آئی جنہوں نے ۱۹۲۰ء میں ''رابطہ قلمیہ'' نام کی ایک ادبی تنظیم کی داغ بیل ڈالی، اس تنظیم کے روح رواں اور بانی گو جبران خلیل جبران تھے، مگر ایلیا ابو ماضی بھی اس کے شاعر اکبر تھے جن کی شاعری نے تمام عرب دنیا میں تہلکہ مچا دیا، اس مضمون میں اسی عظیم شاعر کی شاعری پر بحث و تبصرہ مقصود ہے۔

شاعر متفائل ایلیا ابو ماضی ۱۸۸۹ء میں لبنان کے ایک گاؤں المحیدثہ میں پیدا ہوئے، وہ رابطہ قلمیہ کے ان اہم اراکین میں سے ہیں جنہوں نے جدید عربی شاعری پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے، ان کی شعر گوئی اسی زمانے میں شروع ہوگئی تھی جب وہ ۱۹۰۲ء میں گھر سے بھاگ کر اسکندریہ میں رہنے لگے تھے لیکن ان کی اس دور کی شاعری پر کلاسیکی شعرا جیسے محمود سامی البارودی، اسماعیل صبری، احمد شوقی، اور حافظ ابراہیم کی شاعری کا اثر نمایاں اور ظاہر تھا، اسی طرح ان کی ابتدائی شاعری پر عباسی شعرا ابونواس اور ابو العلاء المعری کا رنگ بھی چڑھا ہوا ہے، ایلیا ابو ماضی فطری شاعر تھے اور نہایت ہی کم مدت میں ان کی شاعری میں پختگی آنے لگی اور اس طرح ان کے قصیدے مصری اور امریکی مجلات مثلاً ''الہدیٰ'' اور ''مرآۃ الغرب'' میں چھپنے لگے، ۱۹۱۱ء میں ان کا پہلا دیوان ''تذکار الماضی'' مصر سے شایع ہوا جس میں بہت سے قصاید کے علاوہ شیخ محمد عبدہ، مصطفیٰ کامل اور یازجی پر مرثیے بھی شامل ہیں۔

ایلیا ابو ماضی ۱۹۱۲ء میں امریکہ چلے گئے جہاں ان کی شاعری نئے رنگ میں رنگ گئی اور اس میں ان کی ذاتی چھاپ بھی نمایاں ہونے لگی، ۱۹۱۸ء میں انہوں نے اپنا دوسرا دیوان ''دیوان ایلیا ابو ماضی'' نیویارک سے شایع کیا جس کا پیش لفظ جبران خلیل جبران نے لکھا تھا، اس دیوان کے قابل قدر قصیدے ''فلسفۃ الحیاۃ''، ''نفسیۃ الشاعر'' اور ''صور الخلود'' ہیں، علاوہ ازیں اس دیوان میں قومی اور سیاسی قصاید بھی شامل ہیں، پہلے دیوان میں ابو ماضی متشائم اور شگون سے متاثر دکھائی دیتے تھے لیکن جب سے وہ امریکی ماحول میں رہنے لگے تب سے ان کا تشائم تفائل میں تبدیل ہونے لگا اور یہ تفائل ان کے قصیدے ''فلسفۃ الحیاۃ'' میں ظاہر ہے جس میں وہ شکایت، بغض، کینہ اور دکھ درد سے بے زار دکھائی دیتے ہیں:

أیہذا الشاکی ومابک داء　　　کیف تغدو اذا غدوت علیلا

ھو عبءٌ علی الحیاۃ ثقیل　　　من یظن الحیاۃ عبئا ثقیلا

والذی نفسہ بغیر جمال　　　لایری فی الوجود شیئا جمیلا

کن ھزارا فی عشہ یتغنی　　　ومع الکبل لایبالی الکبولا

لا غرابا یطارد الدور فی الأر　　　ض وبوما فی اللیل یبکی الطلولا

ایلیا ابو ماضی کی یہ دعوت تفائل اصل میں فارسی شاعر عمر خیام کی رباعیات کے اثر کا نتیجہ ہے، مایہ ناز مصری ادیب ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ ''یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ابو ماضی نے عمر خیام کی رباعیاں پڑھی ہیں اور ان سے متاثر ہوئے ہیں، اسی بنا پر دونوں کے افکار و خیالات یکساں ہیں جیسے عمر خیام زندگی میں لطف اندوزی کی دعوت دیتے ہیں اور کل کے بارے میں یا فنا اور وجود کے اسرار کے بارے میں سوچنے سے دور رہنے کی ترغیب دیتے ہیں کیوں کہ ان سب چیزوں کا حاصل تعب و تکان کے سوا اور کچھ نہیں''[۱]

عالمی جنگوں کے دوران ایلیا ابو ماضی کی شاعری نئی بلندی کو چھونے لگی اور وہ رابطہ قلمیہ کی پہچان بن گئی، یہی وجہ ہے کہ وہ رابطے کے سب سے بڑے شاعر گنے جانے لگے، جس طرح کہ جبران خلیل جبران اس کے نثر نگار اور مصور اور میخائیل نعیمہ اس کے ناقد اور فلسفی گنے جاتے ہیں، ایلیا ابو ماضی کو پہلے دیوان میں تقمص یعنی ''آواگون'' پر ذرا سا بھی اعتقاد نہیں تھا، جیسے:

لیست الروح سوی ھذا الجسد　　　معہ جاءت ومعہ ترجع

لیکن دس سال گزرنے کے بعد ان کا یہ عقیدہ بالکل تبدیل ہوجاتا ہے جس کی ترجمانی ان کے قصیدے ''الدمعۃ الخرساء'' میں یوں نظر آتی ہے:

أنا سأبقی بعدان أمضی الوری　　　ویزول ھذا العالم المنظور

اسی عقیدے کو وہ اپنے مشہور قصیدے ''الطلاسم'' میں یوں دہراتا ہے:

أجدید أم قدیم انا فی ھذا الوجود　　　ھل انا حرٌ طلیق ام أسیر فی القیود

ھل انا قائد نفسی فی حیاتی أم مقود　　　أتمنی انّنی ادری ولکن لست ادری

ہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جبران خلیل جبران اور میخائیل نعیمہ کی صحبت کا نتیجہ ہے کہ ابو ماضی تقمص کے بڑے معتقد بن بیٹھے کیوں کہ جبران اور نعیمہ دونوں تقمص کے نہ

صرف معتقد تھے بلکہ انہوں نے اپنی نگارشات میں اس عقیدے کی خوب تبلیغ بھی کی تھی۔

جس دیوان کی بدولت ابو ماضی کی شاعری کو قبول عام نصیب ہوا وہ "الجداول" ہے، یہ دیوان ۱۹۲۷ء میں نیویارک سے شایع ہوا اور اس کا مقدمہ مشہور ادیب میخائیل نعیمہ نے لکھا ہے، یہ دیوان مہجری ادب کے لیے ایک خاص دریافت تھی جو بعد میں "رابطہ قلمیہ" کے لیے ایک لاثانی سرمایہ بن گیا، اسی دیوان کے بارے میں ڈاکٹر عیسیٰ الناعوری کہتے ہیں کہ "کسی دیوان کو اتنی زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جتنی "الجداول" کو ہوئی"۔[۲]

ڈاکٹر سلیم حیدر اس دیوان کو "زمانے کی زبان" کے نام سے موسوم کرتے ہیں[۳] دراصل یہ رابطہ قلمیہ کا ہی اثر تھا کہ ابو ماضی اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے جبران خلیل جبران اور میخائیل نعیمہ کے شانہ بہ شانہ ترویج ادب میں ان کا ساتھ دیتے رہے، ایلیا ابو ماضی نے اپنی شاعری میں نہ صرف طویل بحروں سے اجتناب کیا ہے بلکہ گنجلک اور موہوم مطلعوں کو بھی اپنانے سے گریز کیا اور ان کی شاعری ان کی طبیعت کی عکاسی کرتے ہوئے محبت اور جمال کی آئینہ دار بنی رہی، اس دیوان کے اکثر قصاید انسانی شعور سے مالا مال اور حسن و جمال میں اپنا جداگانہ مقام رکھتے ہیں، ان میں خیالات کی ندرت و نزاکت اور اسلوب کی جاذبیت اور سلاست عیاں ہے، اسلوب کے اسی امتیاز نے بہت سارے لوگوں کو ابو ماضی کا گرویدہ بنایا ہے، احمد الصافی النجفی وہ پہلا شخص ہے جس نے بہ آواز بلند کہا کہ "ایلیا ابو ماضی قوت شاعری اور شعور صادق کے اعتبار سے امیر الشعراء احمد شوقی پر فوقیت رکھتے ہیں، تاہم قوت نظم اور کثرت شعر کے اعتبار سے احمد شوقی امیر الشعراء ہیں"،[۴] ایک فلسطینی شاعرہ فدویٰ طوقان کہتی ہیں "ابو ماضی میرے پسندیدہ شاعر ہیں اور میں انہیں ہمیشہ چوٹی کا شاعر مانتی ہوں اور کسی بھی قدیم یا جدید رب شاعر کو ان پر فضیلت نہیں دیتی ہوں، وہ مزید کہتی ہیں کہ میرا یہ اعتقاد ہے کہ ابو ماضی جیسے شاعر کی مثال عربی شاعری میں نہیں ملتی ہے"،[۵] دوسری جگہ کہتی ہیں کہ ابو ماضی کی شاعری میں اتنی تاثیر ہے کہ اس کے جادو سے قارئین جھومنے لگتے ہیں۔

ایلیا ابو ماضی کا طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ کائنات کے اسرار پنہاں میں ڈوب کر تسلی بخش اور حتمی جواب کی جستجو میں رہتے ہیں، نہایت جستجو کے باوجود اسے کوئی خاطر خواہ جواب ہاتھ

نہیں آتا ہے، ابو ماضی کے کائنات کے اسرار پنہاں کے تئیں کبھی نہ ختم ہونے والی تڑپ ان کے مشہور قصیدہ "الطلاسم" میں عیاں ہے اور یہ قصیدہ اکہتر رباعیوں پر مشتمل ہے جو ہر بار انسانی علوم کی محدودیت اور مذکورہ اسرار کی نسبت اس کی شکست کے اعلان پر "لست ادری" کے الفاظ سے ختم ہوتی ہے، اس قصیدے کا مطلع یوں ہے:

جئت لا اعلم من این ولکنی اتیت   ولقد ابصرت قدامی طریقا فمشیت
وسابقی ماشیا ان شئت هذا ام ابیت   کیف جئت کیف ابصرت طریقی لست ادری

کائنات کے تئیں حیرت و استعجاب پن قصیدے پر شروع سے اخیر تک محیط ہے، مقطع میں شاعر سخن طراز ہیں:

اننی جئت وامضی وانا لا اعلم   انا لغز و ذهابی کمجیئی طلسم
والذی اوجد هذا اللغز مبهم   لاتجادل ذو الحجی من قال انی لست ادری

ایلیا ابو ماضی زندگی سے بالعموم اور بنی نوع انسان سے بالخصوص والہانہ محبت کرتے ہیں، ڈاکٹر عیسیٰ الناعوری کہتے ہیں کہ "ابو ماضی کی شاعری کا قلم ہمیشہ انسانیت کی خدمت کے لیے وقف رہا ہے"،[۶] انسانوں سے ہمدردی کا یہ جذبہ ان کے قصیدے "الطین" میں عیاں ہے، جس میں وہ ان انسانوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں جنہیں مال و دولت نے دوسروں کے دکھ درد اور بدحالی کو محسوس کرنے سے اندھا بنا دیا ہے، اس قصیدے میں وہ کہتے ہیں:

نسی الطین ساعة انه طین   حقیر، فصال تیها و عربد
وکسا الخز جسمه فتباهی   وحوی المال کیسه فتمرّد
یا أخي! لا تمل بوجهک عنی   ما انا فحمة، ولا انت فرقد
انت مثلی من الثری والیه   فلما ذا یا صاحبی التیه والصد

یہی انسانی محبت "رابطہ قلمیہ" کے ادب کی روح ہے اور ابو ماضی کی شاعری کی جان:

انا بالحب قد وصلت الی نفسی   وبالحب قد عرفت الله

ابو ماضی چند روز کی زندگی کو لطف اندوزی سے گزارنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ انسان کو پرندوں اور ندی نالوں کے ہم سُر ہونے کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے مشہور قصیدے "تعالٰی"

میں یوں مخاطب ہے:

یرید الحب ان تضحک فلنضحک مع الفجر　　وان ترکض فلنرکض مع الجدول والنهر

وان نهتف فلنهتف مع البلبل والقمری　　فمن یعلم بعد الیوم ما یحدث او یجری

۱۹۴۰ء میں ایلیا ابو ماضی نے ''الخمائل'' نام کا ایک اور دیوان شائع کیا جو ۹۳ قصاید پر مشتمل ہے جس میں دو طویل قصیدے ''الأسطورة الأزلیة'' اور ''الشاعر والملک الحائر'' شامل ہیں، فلسطین میں ہو رہی صیہونی جارحیت کا ابو ماضی کے دل پر گہرا اثر ہوا اور اس نے اپنے ایک قصیدے میں اپنے غم کے آنسویوں بہائے ہیں:

فخطب الفلسطین خطب العلا　　وما کان رزء العلا هینا

سهرنا له فکان السیوف　　تحز بأکبادنا ههنا

وکیف یزور الکری اعینا　　تری حولها للردی اعینا

مادر وطن کے ساتھ ساتھ اسے ہمیشہ مصر کی بھی یاد آتی تھی جہاں اس نے جوانی کے دس سال گزارے تھے، کہتے ہیں:

الشرق تاج و مصر منه درته　　والشرق جیش و مصر حامل العلم

مادر وطن لبنان کی یاد اس کے مشہور قصیدے ''الشاعر فی السماء'' میں انتہا کو پہنچتی ہے، اس قصیدے میں وہ اللہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

فقلت یا رب فصل صیف　　فی ارض لبنان أو شتاء

فاننی ههنا غریب　　ولیس فی غربة هناء

تحن نفسی الی السواقی　　الی الأقاصی، الی الشذاء[۷]

ابو ماضی کے انتقال ۱۹۵۷ء کے تین سال بعد ان کا غیر شائع شدہ کلام ''التبر والتراب'' کے عنوان سے ''دار العلم للملایین'' بیروت نے چھاپا اور ان قصاید کو جورج صیدح نے ترتیب دیا، ۱۹۸۶ء میں ''دار العودة'' بیروت نے ''دیوان ابی ماضی'' نام سے ان کا پورا کلام ایک ہی جلد میں شائع کیا ہے جو ۸۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، ایلیا ابو ماضی اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے پیچھے جدید عربی ادب کے لیے ایک عظیم سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، ان کی مایہ ناز شخصیت ان کے عظیم الشان

کلام کی بدولت بیسویں صدی کے پہلے نصف تک جدید عربی شاعری پر راج کرتی رہی اور ہمیشہ کے لیے عرب قارئین کو محظوظ کرتی رہے گی۔

کتابیات

۱- شوقی ضیف: دراسات فی الشعر العربی المعاصر، ص ۱۸۳، دار المعارف بمصر، ۱۹۶۹م۔

۲- عیسیٰ الناعوری: ایلیا ابو ماضی، ص ۲۴، منشورات عویدات لبنان، ۱۹۵۸م۔

۳- سامی الدهان: قدماء و معاصرین، ص ۲۹۰-۲۹۴، دار المعارف بمصر، ۱۹۶۱م

۴- عبد اللطیف شرارہ: ایلیا ابو ماضی، ص ۳۹-۴۰، دار صادر بیروت، ۱۹۶۵م۔

۵- عیسیٰ الناعوری: ایلیا ابو ماضی، ص ۹، منشورات عویدات لبنان، ۱۹۵۸م۔

۶- نفس المرجع: ص ۱۰-۱۲۔

۷- ایلیا ابو ماضی: دیوان ابی ماضی، وهو مجموعة کاملة فی شعره، دار العودة، بیروت، ۱۹۸۶م

مزید مطالعہ کے لیے

۱- محمد عبد الغنی حسن: الشعر العربی فی المهجر الامریکی، دار مصر للطباعة، ۱۹۵۸م۔

۲- سلیمان عیسیٰ و زملاؤہ: الادب العربی الحدیث، الجزء الثالث، المطبعة التعاونیة بدمشق، ۷۰-۱۹۷۱م۔

۳- نادرة سراج: شعراء الرابطة القلمیة، دار المعارف بمصر، ۱۹۵۷م۔

۴- جورج صیدح: ادبنا و ادباؤنا فی المهاجر الامریکیة، معهد الدراسات العالیة، ۱۹۵۶م۔

۵- محمود حامد شوکت و زمیله: مقومات الشعر العربی الحدیث والمعاصر، دار الجیل للطباعة الفجالة، ۱۹۷۵م۔

۶- جمیل جبر: لبنان فی روائع اقلامه، المطبعة الکاثولیکیة، بیروت، ۱۹۶۴م۔

۷- جمیل سعید و زملاؤہ: تاریخ الادب العربی الحدیث، مطبعة بغداد، بغداد، ۱۹۳۹م۔

۸- عمر فروخ: المنهاج الجدید فی الادب العربی، الجزء الثانی، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۶۹م۔

۹- لویس عوض: دراسات فی ادبنا الحدیث، دار المعرفة القاهرة، ۱۹۶۱م۔

۱۰- Journal of Arabic Literature, Leiden, Vol-XVIII-1986.

☆☆☆

اخبار علمیہ

۱۹۹۹ء میں تھریسا ولکیمپ آف جارج ٹاؤن یونی ورسٹی کے ایک اسکالر کی تحقیق کے مطابق میکسیکو میں ۱۰% لبنانی اور شامی نسل کے مسلم تارکین وطن آباد ہیں جو وہاں کے مقامی مسلمانوں سے زیادہ خوش حال ہیں، یہاں کے ادارے MCM (مسلم سنٹر ڈی میکسیکو) کو ۱۹۹۰ء میں رجسٹریشن مل چکا ہے، اس وقت سے ستمبر ۲۰۰۰ء تک MCM نے پانچ مذہبی اجتماعات کیے جن میں بہ تدریج میکسیکن باشندوں کی شرکت کی تعداد اور دل چسپی بڑھتی رہی اور اس کی کوشش سے میکسیکین مسلمانوں کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے، MCM نے نومسلموں کو عقاید و احکام کی بنیادی اور ضروری معلومات بہم پہنچانے کا نظم بھی کیا ہے اور ان میں مزید پختگی اور استحکام لانے کے لیے ماہانہ اور ہفتہ وار پروگرام منعقد کرنے کے علاوہ دار السلطنت اور دوسرے شہروں میں مسلمانوں سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع بھی فراہم کیا ہے، ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے بھی اسلام کے متعلق پروگرام نشر ہوتے ہیں، ملک کی یونی ورسٹیوں میں اسلام کے موضوع پر کانفرنس اور صوبوں میں مذہبی جلسے بھی کرائے جاتے ہیں، ملک کی اکثر لائبریریوں اور بک اسٹالوں میں مستند دینی کتابیں اکٹھا کی جاتی ہیں، اخباروں اور رسالوں میں اسلامی موضوعات پر مضامین طبع ہوتے ہیں، اسی نوعیت کے اور بھی متعدد کام اسلام کی توسیع و اشاعت کے لیے ہو رہے ہیں، مستعد مسلم طلبہ کو تعلیم و مطالعہ کے لیے بیرون ملک بھی بھیجتا ہے، مدینہ یونی ورسٹی اور سعودی عربیہ میں اب تک آٹھ طالب علم بھیجے گئے ہیں، MCM کا اپنا ویب سائٹ بھی ہے جس نے قرآن اور سنت کے متعلق اسپینی زبان میں بہت سی معلومات فراہم کی ہیں، درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مضامین کے ترجمے بھی اسپینی زبان میں کرا چکی ہے، محدود وسایل و ذرایع کے باوجود خود اس نے بعض کتابیں شایع کی ہیں، اس کا ویب سائٹ درج ذیل ہے۔

htt P: IIWWW, Islam-Com.Mcm

(دعوہ انگریزی)

وسط ایشیا میں جمہوریہ کرغستان میں WAMY (ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ) نے شریعت کورس کا اہتمام کیا جس میں ۷۰ر سے زاید حصہ لینے والوں میں متعدد یونی ورسٹیوں کے ۲۲ر عہدے داران اور میڈیا سے وابستہ ۳۰ر افراد اور کچھ اور لوگ بھی تھے، IINA کی رپورٹ کے مطابق یہ کورس کرغستان کلچرل سینٹر نے وزارت تعلیم کے تعاون سے منعقد کیا تھا جس میں مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد لکچرس ہوئے، بعض لکچر مقامی اکیڈمیوں اور اداروں کے نمائندوں نے بھی دیے، لکچرس میں شریک اکثر حضرات کے خیال میں آیندہ اس اقدام سے اچھے نتایج متوقع ہیں۔

مصر میں شہر "کیرو" کی سائنٹفک اکیڈمی برائے تحقیق و مطالعہ قرآن و سنت نے قرآنیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک سالانہ انعامی مقابلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے، سال رواں کا عنوان "قرآن کی روشنی میں جدید سائنسی دریافتیں" ہے، پہلے انعام کے مستحق کو EP.30,000، دوسرے کو 20,000 اور تیسرے EP.5,000 کی رقم مختص کی گئی ہے، مقابلہ میں بلاقید عمر و ملک ہر شخص حصہ لے سکتا ہے، مقالہ ۶۰ر صفحے سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیے جو ۳۰ر جون ۲۰۰۴ء تک درج ذیل پتے پر بھیجا جا سکتا ہے:

3,Wasfi Road Almatbaa Faisal Giza Cairo, EGYPT.

ابراہیم السکران اور عزیز القاسم نے "مذہبی نصاب تعلیم - ایک مطالعہ" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سعودی کا مذہبی نصاب تعلیم تعصب و انتہا پسندی کے فروغ کا سبب ہے، یہ کتاب قومی ڈائیلاگ کے دانش وروں کی دوسری میٹنگ میں سعودی علما کی برہمی کا باعث بنی، ان کے خیال میں اس تحریر کا مقصد مذہب کا استیصال ہے، تقریباً ڈیڑھ سو اسکالروں نے اپنے جاری کردہ متفقہ بیان میں خالص مذہبی نصاب تعلیم (غیر ضروری اور نامناسب) تجدید و اصلاح کے اندیشے سے آگاہ کیا۔

۲۸ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو چھٹی بین الاقوامی زکات کانفرنس عالمی ترقی اور زکات تنظیموں میں ٹکراؤ کے موضوع پر دوحہ (قطر) میں ہوئی جس میں اس خیال کی تردید کی گئی کہ زکات اور خیرات کے ادارے "دہشت گردوں" کو مالی امداد فراہم کرتے ہیں، اس سہ روزہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے عالم اسلام کے مشہور فاضل ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے کانفرنس کے انعقاد کی اہمیت اور

نظام زکات ختم کرنے والوں کا مدلل جواب دیے جانے کی ضرورت اور اس کے مقاصد و فواید بیان کیے۔

آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں کینسر کے مرض کی ابتدا ہی میں شناخت کرلیے جانے کی تحقیق ہورہی ہے، یہ شناخت انسانی جسم میں موجود جین پی آرسی اے 1 اور پی آر سی اے 2 میں ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعہ کی جاتی ہے، یعنی اگر ٹسٹ (جانچ) میں مثبت نتایج سامنے آئیں تو کینسر کے ۸۰% پائے جانے کا امکان ہوتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ میں سو عورتوں کے پستان میں کینسر کی تشخیص روزانہ کی جاتی ہے، ان عورتوں میں اکثر کی مائیں اور بہنیں اس بیماری سے پہلے ہی سے متاثر تھیں۔

چین کے علاقہ سنکیانگ میں زلزلہ سے منہدم مکانات، مدارس اور اسپتالوں کی دوبارہ تعمیر کے بعد حکومت چین نے اس علاقہ کی تقریباً چار سو مسجدیں بنوانے کی ذمہ داری قبول کرلی ہے جو زلزلہ سے ڈھہ گئی تھیں۔

اسکاٹ لینڈ میں ایک کیڑا پایا گیا ہے، برطانوی ہفت روزہ سائنسی جرنل نیچر میں شایع تحقیق کے مطابق اس کی دریافت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر کیڑے مکوڑوں کا وجود بہت قدیم زمانے سے ہے، اس سے پہلے نیویارک میں ایک کھٹمل پایا گیا تھا جس کے متعلق ماہرین کا خیال تھا کہ ۳۷۹ ملین سال پرانا ہے جب کہ اس کیڑے کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اس سے بھی قدیم ۴۳۸ - ۴۰۸ ملین سال پہلے کا ہے، یونی ورسٹی آف کینسس کے مائیکل انجل اور امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری سے وابستہ ڈیوڈ گریملڈی نے اس دریافت سے متعلق اپنے واضح تجربہ کی بنیاد پر بتایا ہے کہ یہ ڈھانچہ مکمل طور پر اس کیڑے کی قدامت کی طرف غمازی کرتا ہے۔ (پانیر، لکھنؤ)

ک، ص اصلاحی

☆☆☆

ادبیات

قطعہ

از:- پروفیسر محمد ولی الحق انصاری ☆

تازہ ہوئی ہے جنگل و کہسار[1] دیکھ کر
فرہاد و قیس عامری خیرہ سر کی یاد

حالاتِ زندگی نے چھڑوایا جو لکھنؤ
آتی ہے حزنِ اختر[2] والا گہر کی یاد

ہر چند ہند میں ہیں، مگر ہند سے ہیں دور[3]
چبھتی ہے دل میں فانیؔ تفتہ جگر کی یاد

غربت کی تلخیوں کا جو چکھنا پڑا مزہ
آتی ہے بد نصیبیِ شاہ ظفر کی یاد

گردونِ دون نے ہم کو ہمایوںؔ بنا دیا
نشتر بنی ہوئی ہے شہ در بدر کی یاد

آدم کی طرح چھوٹ گئی ہم سے بھی بہشت
غربت میں تازہ ہوگئی جدِ بشر کی یاد

ہجرت کے فلسفے کو بھی مت بھول اے ولیؔ
مٹنے نہ پائے طرز شہ بحر و بر کی یاد

غربت ہی میں خدا سے ہوے ہم سخن کلیم
خود ہی دلا رہا ہے خدا اس سفر کی یاد

غربت ہی میں تو پائی شہادت حسینؑ نے
جائے نہ دل سے نوۂ خیر البشر کی یاد

یثرب سے آگئے ترے اجداد لکھنؤ
ہجرت میں اپنی ساتھ رکھ ان کے سفر کی یاد

طیبہ سے تا ہرات و سہالیؔ و لکھنؤ
گزرے جدھر سے دل میں رکھ اس رہ گزر کی یاد

دل سے نہ مٹنے پائے ترے تو جہاں بھی رہ
اسلافِ با صلاحیت و نامور کی یاد

---

[1] سلی گوڑی سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر گھنے جنگل اور فلیٹ سے نظر آنے والا پہاڑی سلسلہ۔ [2] "حزن اختر" واجد علی شاہ کی ایک مثنوی کا بھی نام ہے۔ [3] فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور۔

☆ فلیٹ ۳، بلاک ۶، اکشے تارا اپارٹمنٹس، سیوک روڈ، سلی گوڑی (ویسٹ بنگال)۔

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ اسلام کا سفر حصہ اول

از:- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی ☆

مرتبہ جناب سید علی اکبر رضوی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۷۲، مجلد، ہدیہ: پاکستانی ۶۵۰ روپے، امریکی ڈالر ۲۵، برطانوی پاؤنڈ ۱۸، پتہ: ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ، کراچی، بی-۸۱، کے، ڈی، اے، اسکیم نمبرا-(اے) کارساز روڈ، کراچی ۷۵۳۵۰۔

جناب سید علی اکبر رضوی اب تو پاکستان کے شہر کراچی میں آباد ہوگئے ہیں لیکن ان کا وطن ضلع اعظم گڈھ (یوپی) کا ایک گاؤں ائمہ برسرا ہے، ان کی اعلا تعلیم بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوئی تھی، علم و ادب سے ان کو فطری مناسبت ہے اور اہل علم کی قدردانی ان کی سرشت میں داخل ہے، کاروباری مشغولیتوں کے باوجود قلم و قرطاس سے ان کا تعلق قایم ہے، ان کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق ہے، تجارتی اور کاروباری ضرورتوں سے بھی ان کو سفر کرنا پڑتا ہے۔

رضوی صاحب کو جن ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، ان کے انہوں نے سفرنامے بھی لکھے ہیں جن سے ان کے مشاہدے کی قوت اور طبیعت کی عبرت پذیری کا اندازہ ہوتا ہے، اب تک ان کے حسب ذیل سفرنامے شایع ہوچکے ہیں۔

کوہ قاف کے اس پار، سرزمین انقلاب، ارض جلال و جمال، حدیث عشق، بھارت میں چار ہفتے، بھارت یاترا۔

اب انہوں نے ایک علمی اور تاریخی موضوع کا انتخاب کیا ہے اور تاریخ اسلام کے نام سے یہ کتاب قلم بند کی ہے، جس کا پہلا حصہ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا ہے۔

☆ لکچرر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اردو میں تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ عموماً رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے زمانے سے شروع ہوتی ہیں مگر محترم رضوی صاحب کی کتاب کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے کیوں کہ اسلام کی ابتدا ان کی پیدایش ہی کے زمانے سے ہوئی ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں مکمل ہوگی، یہ پہلا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب وجود باری اور تخلیق کاینات پر ہے جس کے لیے مصنف نے بہ کثرت ماخذ کھنگھالے اور مختلف حوالوں سے مدد لی ہے، ان کی عمر اس وقت قریباً اسی۸۰ سال کی ہوگی، اس پیرانہ سالی میں بھی ان کی صبر آزما محنت و جاں فشانی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ محنت و مطالعہ کے عادی اور علم و تحقیق کے شیدائی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضرت ﷺ تک کے جن انبیا و رسل کو اس کتاب میں موضوع بحث بنایا گیا ہے ان کے حالات و کمالات اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ سرور کونین ﷺ کا سید الانبیا والرسل ہونا خود بہ خود ظاہر ہوجائے ع

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

فاضل مصنف نے انبیا و رسل کے حالات زندگی فراہم کرنے کے لیے قرآن کریم اور کتب تفسیر کو اپنا ماخذ بنایا ہے اور اس سلسلے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر "تدبر قرآن" سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

انبیائے کرام کے دور کی اقوام و ملل اور اشخاص و افراد کے تذکرے میں بھی کا بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے، چنانچہ اصحاب الایکہ، اصحاب الرس، قوم تبع اور اصحاب السبت وغیرہ اور السامری، حضرت مریم، حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ زہرا کے حالات کا گلدستہ کتب تفسیر کے ہزاروں صفحات کے مطالعہ کے بعد سجایا گیا ہے۔

مذاہب کے تعارف میں جامعیت کو مدنظر رکھا ہے اور ان کی ابتدائی تاریخ، عام خصوصیات و امتیازات اور ان کے عقاید و نظریات پر بحث کی گئی ہے، ان مباحث سے عموماً تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی موجودہ کتابیں خالی ہوتی ہیں، ان مباحث کے مطالعہ سے ایک طرف اسلام کی عظمت و حقانیت دنیا کے سامنے آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی دین میں انسانیت کی فلاح و نجات

مضمر ہے اور یہی خدا کا کامل اور سچا دین ہے، جس میں کوئی آمیزش اور ردوبدل نہیں ہوا ہے، اس کے برعکس دنیا کے اور مذہب محرف ومبدل اور ان کی بنیادیں نہایت کھوکھلی ہیں، رضوی صاحب نے ان مذاہب کی کتابوں کا تعارف کرا کے بھی دکھایا ہے کہ وہ انسانی اختراعات کا ملغوبہ ہیں مگر اس ضمن میں بعض مذاہب کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

کتاب کی اس کمی پر بھی نظر پڑتی ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کے عقاید، دینی خیالات، ان کے سیاسی، سماجی اور حربی نظام پر گفتگو نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ کن بتوں کی پرستش کرتے تھے اور کس طرح کے اوہام وخرافات اور جادو ٹونکوں میں مبتلا تھے اور قرآن مجید نے کس طرح ان کے عقاید ورسوم میں اصلاح کر کے ان کے حالات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، زبان وبیان اور شعر وادب میں عربوں کی سرگرمیاں بھی زیر بحث نہیں آسکی ہیں، توقع ہے کہ مصنف آیندہ اڈیشن میں متذکرہ بالا امور کو بھی اس میں شامل کر کے عربوں کے جاہلی دور سے متعلق ایک باب کا اضافہ کردیں گے۔

کتاب کے آخری مباحث میں بعثت نبوی، خاندان رسالت اور آپؐ کی دعوت اور اس کے لیے آپؐ کی مساعی کا جایزہ لیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اس کے لیے آپؐ کو کتنی صعوبتیں اٹھانی پڑیں اور کیسے دشوار مراحل سے گزرنا پڑا، مصنف نے آپؐ کے غزوات اور مکی ومدنی زندگی پر بھی خوبصورت انداز میں بحث کی ہے اور واقعہ معراج پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس پر سرسید مرحوم نے بھی اپنی تفسیر میں بحث کی ہے اور مفسرین کے آرا کا تنقیدی جایزہ لیا ہے جو غالباً رضوی صاحب کے پیش نظر نہیں رہا۔

ادھر پچاس برسوں میں یورپ، امریکہ، عرب ملکوں اور خود برصغیر میں سیرت پاک پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، ایک باب اس کے جایزے کے لیے بھی مختص ہونا چاہیے تھا، رشدی کی بدنام زمانہ کتاب کے بعد اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ڈاکٹر رفیق زکریا کی کتاب محمد اور قرآن لایق ذکر ہے، آیندہ اڈیشن میں اس باب کے اضافے سے یہ کتاب اور زیادہ باوزن، مکمل اور مفید ہوسکتی ہے۔

کہیں کہیں مصنف کا انداز معروضی اور علمی کے بجائے صریحاً جانب دارانہ ہوگیا ہے

جیسے حضرت ابوسفیانؓ کے بارے میں لکھا ہے "ابوسفیان نے جیسے تیسے مسلمانوں کے خوف سے کلمہ تو پڑھ لیا لیکن کفر وشرک اس کے خون میں شیر مادر کی طرح دوڑ رہا تھا" کسی عام مسلمان کے بارے میں اس طرح کے الفاظ مناسب نہیں ہیں، دلوں کا حال اللہ کے سوا کس کو معلوم ہے، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے ایک کافر کو کلمہ پڑھنے کے باوجود بھی جب قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ سخت برہم ہوئے اور فرمایا "تم نے اسے قبول اسلام کے بعد کیوں قتل کیا" تو انہوں نے جواب دیا کہ "اے اللہ کے رسول! اس نے محض خوف سے اسلام قبول کیا تھا، دل سے نہیں قبول کیا تھا"، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا "هل شققت قلبه" (کیا تم نے اس کا سینہ چاک کر کے دیکھا تھا)۔

اچھا مورخ وہی ہے جو ہر قسم کی عقیدتوں سے بے تعلق ہو کر معروضی اور علمی انداز اختیار کرے اور اس کی تاریخ رنگ آمیزی اور جانب داری سے خالی ہو۔

مجموعی حیثیت سے کتاب اچھی اور معلومات افزا ہے، مصنف کا انداز بیان اور مخلصانہ جذبہ قاری کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا ہے، ان کی تحریر تکلف وتصنع سے پاک ہے، دقیق اور پیچیدہ مباحث کو بھی انہوں نے سہل اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے، اس کی وجہ سے ہر استعداد اور مذاق کے لوگ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، کتاب کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ مختلف تاریخی مقامات کی تصاویر سے مزین ہے، نقشہ جات کا سلسلہ پہلے سرسید نے اپنی تفسیر میں شروع کیا تھا بعد میں اس سلسلے کو علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور مولانا مودودی وغیرہ نے آگے بڑھایا۔

دعا ہے کہ رضوی صاحب کی اس مخلصانہ کاوش کو اللہ تعالیٰ قبولیت بخشے اور اسے ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے اور باقی دونوں جلدوں کی اشاعت کا سامان بھی جلد از جلد کردے۔

مطبوعات جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر

فکر و نظر ڈاکٹر محمد حمید اللہ خصوصی اشاعت: مدیر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمن، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۶۱۳، قیمت فی شمارہ: ۶۰/ روپے، سالانہ: ۲۰۰/ روپے، پتہ: شعبہ مطبوعات، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان۔

گزشتہ صدی کے فاضل جلیل ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اللہ تعالیٰ نے درازی عمر کی دولت بخشی اور قریب پچانوے سال کی حیات مستعار ان کو نصیب ہوئی اور اس زندگی کو انہوں نے اپنی مذہبی، علمی و تحقیقی خدمات، تلاش و جستجو، محنت و مشقت سے اوروں کے لیے قابل رشک اور لایق تقلید بنادیا ان کی کتاب زندگی میں ان عنوانات کے علاوہ ان کی سادگی، انکسار، وقت کی قدر اور زہد و ورع اور اسلام کی دعوت و تبلیغ نمایاں ابواب ہیں، وقت کے ایک ایک لمحے کو دین متین کی سربلندی اور علم و تحقیق کی سرخ روئی کے لیے انہوں نے جس طرح صرف کیا وہ ایک مثال ہے، ۲۰۰۲ء میں ان کا انتقال امریکا میں ہوا تو واقعی یہ احساس ہوا کہ شرقی علوم کے اس آفتاب کے مغرب میں غروب ہونے سے دنیاے علم و فضل میں ایک خاموش خلا کی تاریکی چھاگئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علم و تحقیق کی جن راہوں کو وہ روشن کر گئے ان کی تابناکی ہمیشہ ہمیش قایم رہے گی، حق تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف و اظہار ہر دینی و علمی ادارے کی جانب سے ہو، اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے مجلّہ ''فکر و نظر'' کا یہ خاص شمارہ اصلاً اسی اعتراف کی ایک سعی مستحسن ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت اور جہات علمیہ پر بہترین تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے چند اہم خطوط اور ان کی منتخب نگارشات مثلاً قرآنی تصور مملکت، حدیث نبویؐ کی تدوین و حفاظت، دیباچہ صحیفہ ہمام بن منبہ اور تصادم قوانین کا اسلامی تصور اور عمل بھی اس میں شامل ہیں، ایک باب میں ان کی تصنیفات و مقالات کا احاطہ کیا گیا ہے تاہم باب دوم اس لحاظ سے سب سے نمایاں ہے کہ اس میں قرآن مجید، حدیث شریف، سیرت، تاریخ، فقہ، قانون اور دعوت جیسے موضوعات کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب کی علمی خدمات کا بہترین جایزہ لیا گیا، اسی باب کا ایک مضمون معارف اور دارالمصنفین سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے تعلق پر ہے، یہ اس قدر جامع ہے کہ معارف نے مطبوعہ مضامین کے بارے میں اپنی روایت کو نظر

انداز کرتے ہوئے معارف میں اس کو شایع کیا، دوسرے مقالات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں، تاثراتی حصے میں پروفیسر خورشید احمد اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی کی ایسی جھلکیاں ہیں جن سے عموماً واقفیت کم ہے مثلاً جب حکومت پاکستان نے ان کو دس لاکھ کا ایک ایوارڈ دیا تو یہ خطیر رقم انہوں نے ادارہ تحقیقات اسلامی کی نذر کردی جب ان سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو صرف یہ کہا کہ ''اگر میں یہاں لے لیتا تو پھر وہاں کیا ملتا'' یہ جملہ ہی دراصل ان کی پوری زندگی کی تصویر ہے، بحیثیت قرآن مجید کے مترجم کے تحت مصحف عثمانی کے نسخوں کے متعلق عمدہ بحث بھی قابل ذکر ہے جس کے مطابق تاشقند میں موجود مصحف عثمانی مکمل اصل نہیں ہے بلکہ اصل کے عین مطابق نقل ہے، تاہم یہ گوشہ تشنہ ہی رہا کہ اصل مصحف کہاں ہے؟ مکتوبات میں ہر خط، ڈاکٹر صاحب کے علم اور جستجو کی دلیل ہے لیکن ص ۴۵۲ پر ڈاکٹر احمد خاں صاحب کے نام ایک خط بہت اہم ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ جامعہ میونخ جرمنی میں تین پشت سے ایک ادارہ قرآن قایم تھا اور اس میں ساری دنیا سے قریب بیالیس ہزار قرآنی مخطوطوں کے فوٹو جمع کیے گئے تھے، ان کا ایک ایک حرف پڑھ کر کاتبوں کی غلطیاں اس لیے جمع کی گئی تھیں تاکہ اختلافات القرآن کا وجود ثابت کیا جاسکے لیکن بجز کتابت کی غلطیوں کے کہیں بھی اختلاف روایت کا وجود نہیں، ایک خط میں دارالمصنفین سے ان کی خاص محبت کی خوشبو آتی ہے، ڈاکٹر احمد خاں کو لکھا کہ ''ممکن ہے یہ خط آپ کو دارالمصنفین سے واپسی پر ہی ملے وہاں کے تاثرات پر چند سطریں لکھ سکیں تو نوازش ہوگی'' ایک خط سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو اور علوم کے علاوہ نباتات سے بھی دل چسپی تھی، دینوری پر اس سلسلے میں اپنے کام کا انہوں نے اظہار بھی کیا، ان کے فرانسیسی ترجمہ قرآن کا تیرہواں ایڈیشن شایع ہوا تو لکھا کہ ''الحمد للہ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ نسخے ہوگئے ہیں، کہاں میں اور کہاں یہ افضال الٰہی!'' یہ خطوط اس درجہ اہم اور قیمتی ہیں کہ صرف ان کی مدد سے ڈاکٹر صاحب کے ذوق جستجو اور ان کی شخصیت کی دل نوازی پر ایک بہترین مضمون تیار ہوسکتا ہے، ڈاکٹر احمد خاں اور مجلّہ ''فکر و نظر'' ان خطوط کی اشاعت کے لیے خاص طور پر شکریے کے مستحق ہیں، البتہ پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد کے مضمون میں ایک ہی صفحہ پاریس کا املا، جامعہ ماالس، جامعہ پاالس، باالیس، پارلس کی شکل میں نظر آیا۔

غالب نامہ الطاف حسین حالی نمبر: مدیر اعلا جناب پروفیسر نذیر احمد، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۹۵، قیمت: ۱۵۰/ روپے، پتہ: غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

غالبیات کے سب سے بڑے تحقیقی مرکز غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیراہتمام برسوں سے بین الاقوامی سمینار منعقد ہوتے رہے ہیں، غالب کے علاوہ متعلقات غالب بھی ان کا موضوع ہوتا ہے، میرتقی میر اور سودا کے بعد حالی پر بھی ایک سمینار ہوا، زیرنظر شمارے میں اسی مذاکرے کے مقالات ومضامین کو یکجا کیا گیا ہے، یہ قریب تیس مقالات ہیں جن میں حالی کی تنقید، لسانی شعور، اسلوب، مذہبی فکر، معنویت، مقالات، مکاتیب، تصانیف اور سوانح جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، حالی کی شخصیت جتنی نرم اور سادہ تھی، ان کی ادبی زندگی اسی درجہ سرگرم اور جوش وحرارت سے لبریز تھی، یہ فیصلہ بڑا دشوار ہے کہ ان کی عظمت ان کی شاعری میں مضمر ہے یا ان کی تنقید میں یا پھر ان کی تذکرہ نگاری میں لیکن یہ کہنا کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان کے ہم پلہ نہ رہا ہوگا، غیر مدلل مداحی ہے، صحیح یہی ہے کہ وہ نابغہ روزگار تھے، یادگار غالب ہو یا حیات سعدی و جاوید، دیوان ہو یا مسدس، ان سب کی اساسی حیثیت ایک صدی گزرنے کے بعد بھی مسلم ہے، حواشی وتشریحات کی ضرورت کے باوجود ان تمام کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، حالی کے سوانح پر ڈاکٹر خلیق انجم کا مضمون خاصا مفصل ہے لیکن ص ۵۰ پر حالی کی انشاپردازی کے متعلق پروفیسر نذیر احمد کے قول کے اقتباس کا ذکر تو ہے لیکن اصل اقتباس اس میں شامل ہونے سے رہ گیا، ایک مضمون میں روس اور مرکزی ایشیا کی دانش گاہوں میں حالی شناسی کی تفصیل دلچسپ اور پُرازمعلومات ہے، البتہ کتابت کی بعض غلطیاں افسوس ناک ہیں۔

ماہنامہ ضیاء الاسلام قاضی اطہرؒ مبارک پوری نمبر: مدیر جناب ضیاء الحق خیرآبادی، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۴۴۶، قیمت خاص نمبر: ۲۰۰ روپے، سالانہ زرتعاون: ۱۲۵ روپے، پتہ: منیجر ماہنامہ ضیاء الاسلام، مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ۔

قاضی اطہر مبارک پوری کی ذات گرامی ان علمائے راسخین اور قدمائے محققین کی مثال اور نمونہ تھی جن کے لیے جامع کمالات کی تعبیر ہی زیب دیتی ہے، محقق، مورخ، تذکرہ نگار، صحافی اور شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام علوم اسلامیہ کے خدمت گذاروں میں بہت بلند ہے، ذاتی زندگی میں وہ بے حد سادہ منکسر مزاج، خورد نواز اور ظاہری شان وشوکت سے یکسر بے نیاز رہے، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنے مضمون کا عنوان بجا طور پر درویش صفت عالم رکھا، ۱۹۹۶ء میں ان کا انتقال ہوا تو گرچہ ہندوپاک کے تمام اہم جراید ورسائل نے تعزیتی تحریریں سپرد قلم کیں لیکن ان کی اطہر و مبارک زندگی کے مفصل تذکرے کی ضرورت کا احساس رہا، ان کے رفیق قدیم مولانا اسیر ادروی نے اپنے رسالہ "ترجمان الاسلام" بنارس کا ایک خصوصی شمارہ شایع کر کے اس ضرورت کی کسی حد تک تکمیل

بھی کی، زیرنظر خاص نمبر بھی اسی ضرورت کے پیش نظر شایع کیا گیا، قریب پچیس مضامین میں قاضی صاحب کی زندگی، تصنیفات اور تمام علمی خدمات کا استقصا کیا گیا ہے، مقالہ نگار حضرات میں قاضی صاحب کے احباب، تلامذہ اور اعزا کے نام جیسے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عثمان معروفی، ڈاکٹر نعیم صدیقی، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، مولانا افضال الحق قاسمی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، قاضی ظفر مسعود اور مولانا مسعود سعید الاعظمی اور خود ماہنامہ ضیاء الاسلام کے مدیر کے علاوہ سرپرست رسالہ مولانا اعجاز احمد اعظمی وغیرہ شامل ہیں، قاضی ظفر مسعود کے ایک مضمون میں کیفی اعظمی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ "اسلام میں انسانیت کو سمیٹنے کی جو خوبی ہے، شبلی میں وہ خوبی پوری طرح ملتی ہے، شبلی کی یہ خوبی ان کے ہم وطن قاضی اطہر مبارک پوری میں بھی ملتی، ان کی نثر پر شبلی کی پوری چھاپ ہے"، سرپرست رسالہ کے قلم سے کئی مضامین ہیں لیکن اس خاص نمبر کی رفعت وافادیت میں اضافہ کی وجہ قاضی صاحب مرحوم کی غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح، کاروان حیات کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد ممبئی کے قیام تک کے حالات بڑے شگفتہ اور دلکش انداز میں تحریر کیے، اس سے پہلے قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک کے ان کی سوانح کے ابتدائی نقوش کا مرقع بھی شامل کیا گیا ہے، یہ رسالہ طبع ہو چکا تھا، اس طرح گویا قاضی صاحب کی مکمل سوانح عمری ان صفحات میں آگئی ہے، یہ سوانح اس قدر دلچسپ ہیں کہ آخر تک پڑھے بغیر نہیں رہا جاتا، قاضی صاحب کی زندگی اور ان کے علمی کمالات پر داد تحقیق دینے والوں کے لیے شاید یہ خاص نمبر سب سے زیادہ معاون اور کارآمد ثابت ہوگا، کم لوگوں کو علم ہے کہ قاضی صاحب کا شعری ذوق بڑا بلند اور پاکیزہ تھا، وہ قادرالکلام شاعر بھی تھے، ان کی چند نعتوں، غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی مئے طہور کے نام سے اس میں شامل کردیا گیا ہے، ایک مضمون قاضی صاحب کے جواں سال اور باکمال فرزند مولانا خالد کمال مرحوم پر ان کے برادر اصغر قاضی ظفر مسعود کے قلم سے ہے اور بڑا پراثر ہے، مولانا خالد کمال نے گھانا اور نیوزی لینڈ میں اسلام کی اشاعت اور فتنۂ قادیانیت کا ردشد ومد سے کیا، نیوزی لینڈ میں ہی ان کا انتقال ہوا، اس عمدہ اور مفید خاص نمبر کی اشاعت کے لیے "ضیاء الاسلام" کے مدیر اور سرپرست لایق تبریک وتحسین ہیں کہ انہوں نے ایک علمی قرض اور فرض کو بحسن وخوبی ادا کردیا۔

سہ ماہی انتساب ایوب واقف نمبر: مدیرہ محترمہ آسیہ سیفی، مرتب جناب سیفی سرونجی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۵۶، قیمت فی شمارہ: ۵۰ روپے، سالانہ: ۲۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر سیفی سرونجی، سیفی لائبریری سرونج، مدھیہ پردیش۔

ادیب ونقاد اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے جناب ایوب واقف سے اردو کا ہر باذوق قاری واقف ہے، اعظم گڑھ کی خاک کی تاثیر ان کے خمیر میں شامل رہی، شبلی کالج کے زمانہ طالب علمی میں دارالمصنفین سے ان کے تعلق اور بزرگان دارالمصنفین سے ان کی عقیدت وشیفتگی نے ان کے مذاق علمی کو جلا بخشی اور جس کا ظہور بعد میں ممبئی کی فضا میں ہوا، ذکر رفتگاں، شعور وادراک، تعبیر وتشریح اور میں زندہ ہوں جیسی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں اور مقبول ہوئیں، جگن ناتھ آزاد پر تو گویا وہ سند کا درجہ رکھتے ہیں، علی سردار جعفری بھی ان کا محبوب موضوع ہیں، ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے بے شمار مضامین سپرد قلم کیے جو ذہن وطبیعت کی سلامتی، نظر کی وسعت اور قلم کی شرافت کی وجہ سے پسند کیے گئے، درس وتدریس میں کامل انہماک کے باوجود ان کی علمی وادبی سرگرمیاں باعث حیرت بھی ہیں اور قابل تحسین بھی، زیرنظر خاص نمبر کے مرتب ذاتی زندگی میں واقف صاحب کی محبت کے اسیر ہونے کے علاوہ ان کے ادبی محاسن کے مداح وقدرداں بھی ہیں، یہ نمبر سخن شناسی کی قدر وتحسین کی اچھی اور تقلید کے لایق مثال ہے، جس میں کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، وامق جون پوری، خلیق انجم، علی جواد زیدی، رفعت سروش اور پروفیسر خورشید نعمانی جیسے مشاہیر شعر وادب کی تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے، مدیر معارف کے قلم سے واقف صاحب کی دو کتابوں مکاتیب نگم اور شعور وادراک پر تبصرہ ہے، جس میں واقف صاحب کے قلم کی پختگی کی سند کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ نامساعد حالات میں بھی علم وادب کی خدمت میں منہمک ہیں، نامساعد حالات کی ایک جھلک جابجا مضامین میں آگئی ہے اور یہ دوسروں کے لیے بڑی حوصلہ افزا ہے، مشفق خواجہ کو واقف صاحب کی یہ بات اچھی لگی کہ وہ تحقیقی مضامین میں بھی ذاتی حوالوں سے دل چسپی پیدا کردیتے ہیں، ایک خط میں ان کے استاد سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا کہ تم جیسے شاگردوں پر مجھے ناز ہے، یہ سند واقف صاحب کے کارناموں کے بیان میں کچھ کم نہیں، سرونج جیسی دور افتادہ بستی سے اس خوبصورت اور مفید نمبر کی اشاعت کے لیے رسالہ انتساب کے ذمہ دار اہل علم وادب کی طرف سے داد کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ ترجمان القرآن، اشاعت خاص سید ابوالاعلیٰ مودودی: مدیر جناب پروفیسر خورشید احمد، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۳۴، قیمت: ۶۰؍روپے، سالانہ: ۲۰۰؍روپے، پتہ: ۵-۱اے، ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور، پاکستان۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے، ۲۰۰۳ء میں صد سالہ سال ولادت کے موقع سے ان کے جاری کردہ رسالہ ترجمان القرآن نے بجاطور پر احسان مندی اور محسن شناسی کے

طور پر اس اشاعت خاص کا اہتمام کیا، یہ پہلا حصہ ہے، دوسرا حصہ شاید ابھی طبع نہیں ہوا، پیش نظر شمارے میں قریب تیس مضامین ہیں، موضوعات کے تنوع کے باوجود ان سب میں قدر مشترک مولانا مرحوم کی حق پرستی اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ان کی جاں کوشی کا بیان ہے، شاید اسی لیے اس کو ایک ایسے عہد کی داستان سے تعبیر کیا گیا جو ایک مجاہد صفت انسان کی ایمان افروز کہانی اور تاریخ دعوت و عزیمت ہے، اخوان المسلمین کے مرشد عام محمد مامون الہضیبی کا مضمون حسن البنا اور سید مودودی، احیائے اسلام کے قایدین کے عنوان سے ہے، اس میں ان دونوں قایدین کے متعلق لکھا گیا کہ مشکل ترین علوم کو بے حد آسان پیرائے اور اسلوب میں پیش کرنا ان حضرات کی بڑی خوبی ہے، سری لنکا کے وزیر پارلیمانی امور کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تفہیم القرآن کا سنہالی زبان میں ترجمہ ہورہا ہے، جرمنی کی ایک نومسلمہ فاطمہ گریم نے لکھا کہ مولانا اپنی تمام مصروفیات کے باوجود نومسلموں کی مشکلات اور مسایل سے بے تعلق نہیں رہتے تھے، قدر تناسب سے جامع مضمون خود مدیر ترجمان القرآن کا ہے جنہوں نے اپنے دل کش اسلوب میں زندگی کی مقصدیت، وقت کی قدر، عبادات میں توازن واعتدال، طریق تربیت، حفظ مراتب وغیرہ مولانا مرحوم کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے، یہ اور دوسرے تمام مضامین مولانا مودودی کی شخصیت کی قدر وقیمت متعین کرنے کے مقصد سے لکھے گئے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہیں۔

جریدہ قدیم لسانیات وکتبات نمبر: مرتبہ جناب سید خالد جامعی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۶۹، قیمت: ۱۰۰؍روپے، پتہ: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، پاکستان۔

جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف وتالیف کا یہ علمی تحقیقی رسالہ قریب سترہ سال کے تعطل کے بعد اب پھر شایع ہونے لگا ہے، اس زندگی نو میں زیادہ قوت، توانائی اور حرکت ہے، اس کے کئی شمارے ابلاغیات، جمالیات، ماحولیات اور لسانیات کی اصطلاحات کے لیے خاص ہوئے، زیرنظر شمارے میں وادی سندھ میں قدیم انسانی تہذیب کے دریافت شدہ آثار ونقوش کے متعلق مباحث کو یکجا کیا گیا ہے، موہن جوداڑو کی نو دریافت مہریں اور سندھ کی قدیم زبان سے متعلق مشہور فاضل اور دارالمصنفین کے سابق رفیق مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم کو درجہ اختصاص حاصل تھا، انہوں نے پاکستان جانے کے بعد قدیم سندھی تہذیب وزبان کے مطالعہ وتحقیق پر اپنی ساری توجہ مرکوز کی اور اس باب میں حیرت انگیز معلومات فراہم کیے، ان کا دعوی تھا کہ قدیم وادی سندھ کی زبان سنسکرت یا دراوڑی کی بجائے شمسوایلونا اور سدوم کی پانچ ہزار سال پہلے کی عربی زبان ہے، بجز چین کے قریب تمام زبانوں کی ابجدوں کا سلسلہ ہڑپہ کے کتبات سے ملتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ان کا یہ دعوی تھا کہ تمام بنوسام کے اسلاف

کا ابتدائی وطن یہی وادی سندھ تھی، عرب قوم بھی پہلے یہیں بستی تھی، یہ دعوے گرچہ حتمی ثبوت کے آج بھی محتاج ہیں تاہم مولانا ابوالجلال ندوی کے دلایل قابل غور بہرحال ہیں، مولانا کی اس قسم کی تحقیقات کچھ طبع ہوئیں اور کچھ اب تک غیر مطبوعہ ہی رہیں، اس شمارے میں شاید ایک مضمون غیر مطبوعہ ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ مضامین اگلے شماروں میں شایع ہوں، یہ کہنا بجا ہے کہ اگر یہ اردو کی بجائے کسی اور زبان کو ذریعہ اظہار بناتے تو شاید ان کی تحقیقات سے ماہرین آثار قدیمہ حیران رہ جاتے، مولانا کے مضامین کے علاوہ وادی سندھ کے رسم الخط اور بادِ امن کی تہذیب پر تین عالمانہ مقالے بھی ہیں، آخر میں مولانا ابوالجلال مرحوم کے مضامین کی مکمل فہرست بھی ہے، یہ جریدہ سندھ کی تاریخ وتہذیب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے خاص طور پر مطالعہ کے لایق ہے، اصحاب جریدہ نے ان نادر اور اب نایاب مضامین کو یکجا کرکے بڑی علمی خدمت انجام دی۔

ماہنامہ الحق، اشاعت خصوصی اکیسویں صدی کے چیلنجز اور عالم اسلام: مدیر جناب مولانا سمیع الحق، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۸۴، قیمت: ۸۰؍روپے، سالانہ: ۲۰۰؍روپے، پتہ: ماہنامہ الحق، جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ، خٹک نوشہرہ (سرحد) پاکستان۔

اکیسویں صدی کا آغاز ہوا تو عیسائیت کی سیاسی اور مذہبی قیادت نے صلیبی جنگ کی یاد تازہ کی، مسلمانوں کو انتہا پسند اور تخریب کار کے پردے میں دشمن قرار دیا گیا اور یورپ نے تو صراحۃ کہا کہ یہ نئی صدی عیسائیت کی ترویج وبرتری کے لیے ہے اور چوں کہ عیسائیت کی قدیم زمین ایشیا کی ہے، اس لیے یہ کوششیں اسی سرزمین پر مرکوز رہیں گی، اب تک کے واقعات نے اس احساس کو سچ ہی ثابت کیا ہے، اسی حقیقت کے پیش نظر یہ خاص نمبر بھی شایع کیا گیا، اس کے مدیر محترم پاکستان میں اسلام کے نمایاں نام لیواؤں اور راہ حق میں ہر قسم کی قربانی دینے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں، قومی اسمبلی میں ان کی تقریریں اسلام کے لیے درد اور جذبہ ایثار وقربانی کے باب میں اپنا مقام رکھتی ہیں، اس خاص شمارے میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ نئی صدی میں امت مسلمہ کی ذمہ داریوں، خصوصاً علما کے کردار، مغرب کی فکری وعسکری یلغار کے متعلق مفید تحریریں یکجا کردیں، چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ یوسف القرضاوی، مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا تقی عثمانی اور برصغیر کے دوسرے ممتاز اہل قلم علما ومفکرین کی تحریروں کو سلیقے سے جمع کرکے امت کے سامنے ایک مفصل لائحہ عمل پیش کردیا گیا ہے، یہ شمارہ ۲۰۰۱ء میں شایع ہوا تھا، افسوس ہے کہ اس کا ذکر خاصی تاخیر سے آرہا ہے لیکن اس کی اہمیت [illegible] آج بھی ہے اور پہلے سے سوا ہے۔

ماہنامہ راہ اعتدال، زکوۃ نمبر: مدیر مولانا جناب حبیب الرحمن عمری، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۵۲، قیمت: ۲۵؍روپے، سالانہ: ۸۰؍روپے، پتہ: منیجر راہ اعتدال، جمعیت ابنائے قدیم، جامعہ دارالسلام، عمرآباد، تامل ناڈ۔

جامعہ دارالسلام کا ترجمان یہ رسالہ اپنے نام کے عین مطابق معتدل ومتوازن اور سنجیدہ علمی ومذہبی مضامین کی اشاعت میں مصروف عمل ہے، دوسرے ارکان اسلام کی بہ نسبت زکوۃ پر عموماً کم لکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ احساس قطعی درست ہے کہ زکوۃ ایسا فریضہ ہے کہ وقت اور حالات کے ساتھ اس میں نئے مسایل اور ضروریات پیش آتے جاتے ہیں، اب یہ محض سونا چاندی اور بعض مرجہ نصاب تک محدود نہیں، دور جدید کی مالیات واقتصادیات نے دولت کے ارتکاز اور تقسیم کو عجیب عجیب نئی شکلیں دے دی ہیں، ان کی شناخت اور حل کے دریافت کی غرض اس نمبر کا قابل قدر مقصد ہے، حالانکہ اکثر مضامین زکوۃ کی فرضیت اس کی تاریخی اور مذہبی اہمیت اس کے افادی واخلاقی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں، جدید مسایل پر صرف ایک مضمون ہے اور وہ بھی مختصر، اس کا احساس خود مدیر محترم کو بھی ہے تاہم مجموعی لحاظ سے زکوۃ اور اس کے متعلقات پر اس کے مباحث میں افادیت ہے، مولانا محمد ابراہیم عمری کا مضمون مسئلہ تملیک اور زکوۃ بھی ذکر کے لایق ہے جنہوں نے اس نازک پہلو پر محتاط انداز میں اظہار خیال کیا ہے، تملیک کی صورتوں میں اجتماعی کفالت، اشیائے ضروریہ کی تقسیم، مستحقین کے لیے گھر اور کارخانوں کی تعمیر جیسے پہلو غور طلب ہیں۔

ماہنامہ طوبیٰ، جامعہ امام ابن تیمیہؒ نمبر: مدیر جناب محمد ارشد المدنی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۸۴، قیمت فی شمارہ: ۱۰؍روپے، سالانہ: ۱۰۰؍روپے، پتہ: علامہ ابن باز اسلامک اسٹڈیز سنٹر، ابوالکلام آزاد لائبریری بلڈنگ، مدینۃ السلام، مشرقی چمپارن، بہار۔

بہار کا خطہ چمپارن نیپال کی سرحد پر واقع ہونے اور بدھ اور ہندو مذہبوں کے آثار کی وجہ سے غیر معروف نہیں، اس خطے میں مسلمان خاصی تعداد میں یعنی قریب تیس فیصد ہیں، کبھی یہ خطہ بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسموں میں ملک کے اور علاقوں کی طرح ہی تھا لیکن بعد میں یہاں کتاب وسنت کی اصل تعلیمات کے فروغ کی کوششیں کی گئیں جن کا ایک مظہر جامعہ ابن تیمیہ بھی ہے، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کی مساعی حکیمانہ سے یہ جامعہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، زیر نظر شمارہ میں اسی سفر کی تفصیلات سلیقے سے بیان کی گئی ہیں۔

ع-ص

☆☆☆

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اسوۂ صحابہؓ (حصہ اول): اس میں صحابہ کرامؓ کے عقاید، عبادات، اخلاق ومعاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰/روپے

اسوۂ صحابہؓ (حصہ دوم): اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت ۵۶/روپے

اسوۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ قیمت ۴۰/روپے

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ: اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ قیمت ۳۲/روپے

امام رازیؒ: امام فخرالدین رازیؒ کے حالات زندگی اور ان کے نظریات وخیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ (زیر طبع)

حکمائے اسلام (حصہ اول): اس میں یونانی فلسفہ کے ماخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت ۱۵۰/روپے

حکمائے اسلام (حصہ دوم): متوسطین ومتاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۴۰/روپے

شعر الہند (حصہ اول): قدما سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ قیمت ۸۰/روپے

شعر الہند (حصہ دوم): اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی وادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۷۵/روپے

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ قیمت ۱۲۵/روپے

انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاپردازانہ ترجمہ۔ قیمت ۵۵/روپے

مقالات عبدالسلام: مولانا مرحوم کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۶۰/روپے

اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ وشاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت ۷۵/روپے

....